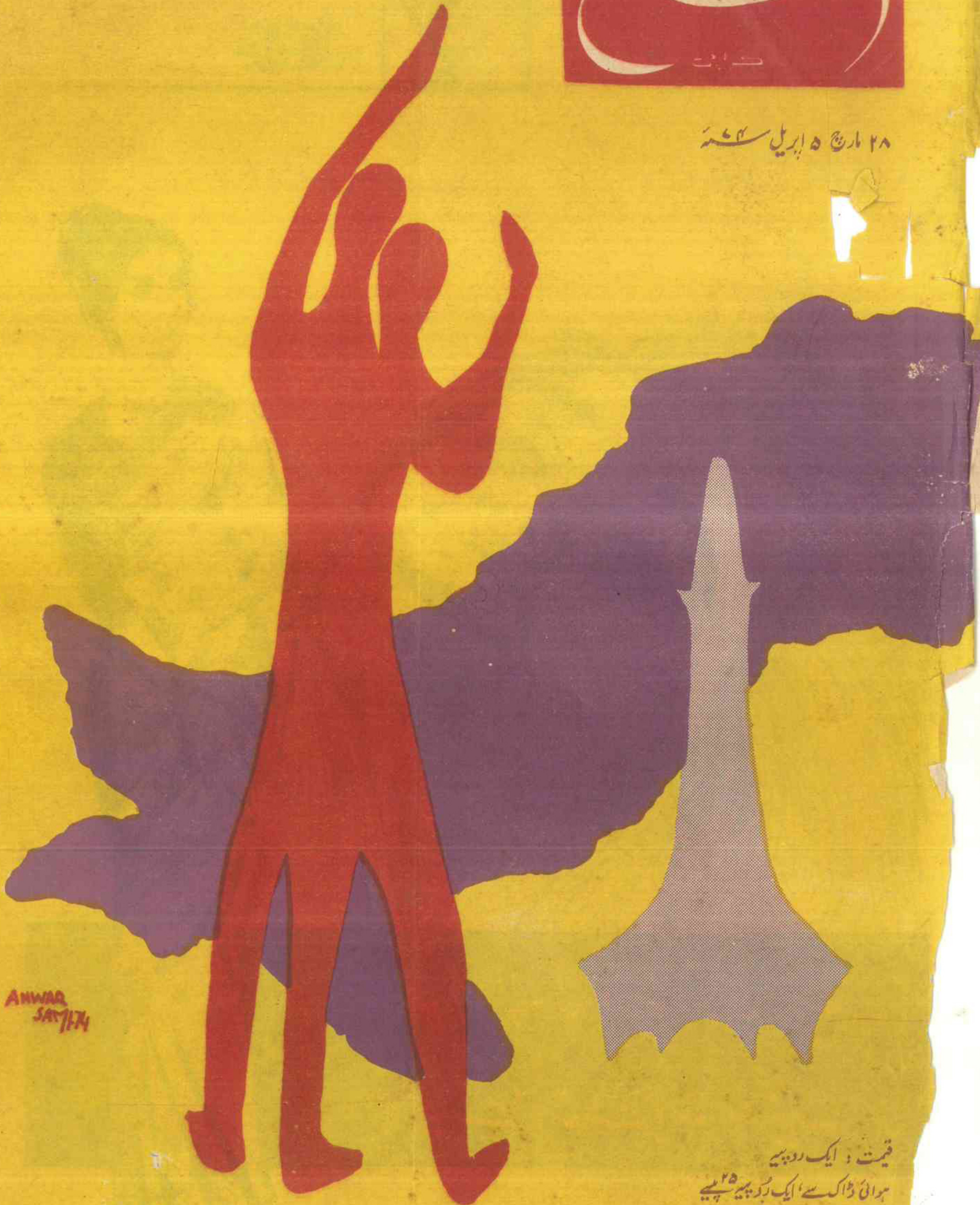
ہفت روزہ

الفتح

کراچی





جمیل الدین عالی





سچائی اور اچھائی اور سندرتا ہیں ایک

جو سچا ہے وہ سندر ہے جو سندر وہ نیک

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

۲۸ مارچ - ۵ اپریل ۱۹۷۴ء
قیمت، ایک روپیہ
ہوائی ڈاک سے، ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ہفت روزہ
الفتح

جلد: ۴ شمارہ: ۴۶

یوم پاکستان - اشاعت خاص

خاص مضامین

سرورق • انور سمیع

فون ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

یوم پاکستان، نئے تقاضے

اس سال پوری قوم نے یوم پاکستان ماضی کی تلخ یادوں، حال کی کامیابیوں اور روشن مستقبل کے لئے جہد مسلسل کے عہد کے ساتھ منایا، وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ اس سال ہم یوم پاکستان بھرپور اعتماد اور نئے عزم کے ساتھ منا رہے ہیں۔ کہ مستقل آئین کے نفاذ کے بعد ملک اور قوم کو کسی گروہ یا ٹولے کی آمریت کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ جنگ ۷۱ء کے اثرات تیزی سے زائل ہو رہے ہیں اور نیا پاکستان مستحکم بنیادوں پر تعمیر ہو رہا ہے۔

رواں سال اندرونی اور بین الاقوامی سطح پر وزیر اعظم بھٹو کی مثالی کامیابیوں سے عبارت ہے، تاریخ پاکستان میں اس سال کو ہر لحاظ سے اہمیت دی جاتے گی اور آئندہ کا مورخ جب تیسری دنیا کے اتحاد کے مختلف مراحل کو قلم بند کرے گا تو کسی طور بھی پاکستان کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد موجودہ حکومت کا یقیناً ایک بڑا کارنامہ ہے، اس کانفرنس کے فیصلوں کو دیکھا جاتے تو ان سے سامراج دشمنی کی عکاسی ہوتی ہے اور وہ افریشیائی اتحاد کی جانب ایک اہم قدم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کانفرنس بنڈونگ کانفرنس سے کم اہم نہ تھی۔ سامراج نے جس طرح بنڈونگ کے فیصلوں کو سبوتاژ کرنے کی کارروائیاں کیں، لاہور کانفرنس کو بھی ان خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سامراجی مفادات پر جہاں کہیں زد پڑتی ہے وہ مکمل مزاحمت کرتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی بھی صورت میں اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ افریشیائی ممالک ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو کر اس کے خلاف ایک موثر طاقت بن سکیں۔ بنڈونگ کانفرنس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ۷۴ء اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ امریکی سامراج نیا انڈونیشیا بنا سکے۔

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی سے شائع کیا۔

وزیرِاعظم بھٹو نے اپنے پیغام میں جہاں اپنی حکومت کی تین نمایاں کامیابیوں کا تذکرہ کیا ہے وہاں پاکستانی قوم کی طرف سے بروقت یہ انتباہ بھی کر دیا ہے کہ مستقل آئین کے نفاذ کے بعد کسی بھی گمراہ یا اقتدار پسند ٹولے کو غیر جمہوری راستے اپنانے کی گنجائش نہیں رہی اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئین میں جمہوریت اور جمہوری اداروں کو فروغ کی جو ضمانت دی گئی ہے وزیرِاعظم اس پر سختی سے کاربند رہنا چاہتے ہیں تاکہ آمریت کو روکا جا سکے۔ یہ جذبہ قابلِ قدر ہے اور اس کے ساتھ ہی ایسے اقدامات کا متقاضی ہے جو عوام میں جمہوریت کے فروغ کا جذبہ پیدا کریں۔ اور جمہوری اداروں کو مضبوط اور مستحکم بنائیں۔ آئین ایک مقدس دستاویز ہے اس کا تحفظ ایک مقدس فریضہ ہے، لیکن الفاظ کے ہیر پھیر یا اس کے تقدس کی محض تشہیر سے مقصد پورا نہیں ہو گا بلکہ اس دستاویز کے ایک ایک لفظ پر صحیح معنوں میں عمل سے ہی حصولِ مقصد ممکن ہے، ورنہ اس کی حیثیت محض کاغذی رہ جائے گی۔

اندرونی استحکام کے حصول کے لئے معاشرے کی تشکیل ناگزیر ہے، پاکستان جمہوریت کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ موجودہ صورتِ حال کو جمہوریت کا نام نہیں دیا جا سکتا ایسا کہنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہو گا ہمیں اندرونی سطح پر متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان میں بلوچستان کا مسئلہ سرِفہرست ہے، یہ درست ہے کہ جمہوریت ملک سے وفاداری کی حد تک ہی اپنا دائرہ متعین کرتی ہے۔ اور ملک کے کسی بھی حصے کے افراد کو ملکی مفادات کے خلاف جمہوریت کے نام پر سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتی۔ ایسا ہوتا تو بابائے قوم قائدِاعظم محمد علی جناح شمال مغربی سرحدی صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت نہ توڑتے، بلوچستان میں بعض ایسے حالات پیدا ہوتے جن کی بناء پر وفاقی حکومت کو کارروائی کرنی پڑی۔ یہ کہاں تک صحیح یا غلط الزامات ہیں اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی، تاہم بلوچستان کے منتخب نمائندوں اور وفاقی حکومت کے درمیان ابھی تک کسی افہام و تفہیم سے گریز ایسے شکوک و شبہات کو جنم دے رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس صوبے میں جمہوری اقدار پامال ہو رہی ہیں۔ اس کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ وزیرِاعظم بھٹو کی کوششیں اپنی جگہ پر ہیں، یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم رہی تو اس کے نتائج ملک کے مفاد میں نہ ہوں گے، اور جمہوریت کو نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑیگا۔

جمہوری معاشرے میں جہاں حکومت کی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، وہاں حزبِ اختلاف بھی اس سے بری الذمہ نہیں ہوتی، جب حکومت اور حزبِ اختلاف کسی مسئلے کے حل میں ناکام ہو جاتی ہیں تو پھر تیسرے فریق کی دلچسپیاں بڑھنے لگتی ہیں اس فریق کو اندرونی اور بیرونی دونوں محاذ پر خفیہ ہاتھوں کی مکمل تائید حاصل ہوتی ہے۔ پاکستان میں ماضی ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے لہٰذا آزادی کا تحفظ حکومت اور حزبِ اختلاف دونوں کی ذمہ داری ہے۔ دونوں کو اس کے لئے مثبت کارروائی کرنا ہو گی ایسا نہ ہوا تو یہ کامیابیاں ناکامیوں کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہیں۔

آہ! پروفیسر حمید احمد خان

۲۲ مارچ ۷۴ء کو پاکستان ایک ممتاز ماہرِ تعلیم، اسکالر اور مدبر پروفیسر حمید احمد خاں سے محروم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مرحوم کی تعلیمی اور ادبی خدمات ہماری تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے اس ادارے کو مشرقی روایات کا مثالی گہوارہ بنایا اور دوسرے اداروں کو ان روایات کی تقلید کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ درس و تدریس کے ادارے نصابی ذمہ داریاں پوری کرنے تک محدود نہیں بلکہ ان میں پڑھنے اور پڑھانے والے ایک خاندان کے افراد ہیں۔ وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی وہ انہی کوششوں میں مصروف رہے، ناکامی کا لفظ خان صاحب مرحوم کی لغت میں درج نہیں تھا۔ وہ ہر قدم پر کامیاب ہوتے، اس کی وجہ ان کے مشن کا خلوص تھا۔ قوم سے محبت تھی اور نئی نسل کی تربیت کے لئے بے لوث اور ان تھک محنت تھی۔

پروفیسر حمید احمد خان کی موت ایک عظیم انسان کی موت ہے، اتنے بڑے لوگ صدیوں بعد ہی پیدا ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پوری قوم مرحوم کا سوگ منا رہی ہے۔



احوالِ واقعی

واقفِ حال

مجیب نے پاکستان آنے سے پہلے اندرا سے بات کی تھی

بنگلہ دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن علاج کروانے ماسکو جا چکے ہیں۔ وہ کس عارضہ میں مبتلا ہیں؟ اس سلسلے میں ڈھاکہ اور ماسکو کی حکومتیں بالکل خاموش ہیں۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران ہم نے شیخ صاحب کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ وہ بالکل بھلے چنگے تھے پہلے سے زیادہ فربہ اور توانا تھے۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک، ہفتے کے بعد وہ اتنے بیمار ہو جائیں گے کہ اُنہیں ماسکو کے لئے رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔ اور اُن کو ماسکو لے جانے کے لئے روسی طیارے اور ڈاکٹروں کی ایک جماعت ڈھاکہ آئے گی۔ سیاسی مبصرین علاج کیلئے ماسکو کے انتخاب کو بہت اہمیت دے رہے ہیں کیونکہ مرحوم صدر ناصر کے بعد غالباً شیخ مجیب الرحمٰن دوسرے سربراہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے علاج کے لئے ماسکو کو منتخب کیا۔ یادش بخیر! مرحوم صدر ناصر ۲۹ جون ۱۹۷۰ء کو سوویت یونین کی دعوت پر اپنا علاج کرانے ایک ہفتے کے لئے ماسکو گئے تھے۔ وہاں اُنہیں ایک ہفتے کی بجائے پورے اٹھارہ دن قیام کرنا پڑا۔ اِن ۱۸ دنوں میں اُنہوں نے علاج معالجے کے ساتھ ساتھ روسی رہنماؤں سے خفیہ مذاکرات بھی کئے۔ صدر ناصر کی "صحت یابی" کے بعد ایک مشترکہ اعلامیہ بھی جاری ہوا تھا۔ جس میں عرب، مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کی فوجوں کے انخلا اور اقوامِ متحدہ کی قرارداد پر عمل درآمد کرانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اِس اعلان میں فلسطینی عوام اور اُن کی جدوجہد آزادی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ صدر ناصر نے قاہرہ لوٹتے ہی امریکی سامراج کی نام نہاد "تجاویز امن" یعنی راجرز پلان کو منظور کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی بیماری کے سلسلے میں مختلف نوع کی قیاس آرائیاں جنم لے رہی ہیں۔

دراصل پاکستان کی جانب سے بنگلہ دیش تسلیم کئے جانے کے بعد وہاں کی سیاست ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ جب تک پاکستان نے بنگلہ دیش تسلیم نہیں کیا تھا۔ اُس وقت تک بنگلہ دیش میں توازن سیاست بھارت اور روس نواز عناصر کے حق میں تھا۔ اُن کا پلڑا بھاری تھا۔ یہ درست ہے کہ اُس وقت بھی بنگلہ دیش میں بائیں بازو کے عناصر اور عوام بھارت اور روس کی بالادستی کیخلاف تھے۔ طہٰ، متین، علاؤالدین، حق، اور سراج سکندر گروپوں کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہے اور اس کی غلامی کے ذمہ دار روس اور بھارت ہیں، چنانچہ یہ نعرہ زد زبان خاص و عام تھا کہ "باہر کا ہر کالا آدمی" ہندوستانی" اور ہر گورا" روسی" ہے"۔ لیکن ان عناصر کا منہ انہیں "پاکستان نواز" قرار دے کر بند کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ بھارتی اور روسی غلامی کا احساس دوچند ہو گیا ہے۔ اور بھارت اور روس کے مخالفین کا پلڑا بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ عوامی لیگ بھی دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک بھارت کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسرا ابھی تک بھارت کا ہمدرد ہے۔

جہاں تک بنگلہ دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن کا تعلق ہے۔ وہ پاکستان سے خوشگوار اور برادرانہ تعلقات استوار کرنے کے حق میں ہیں تاکہ برصغیر میں پائیدار اور مستقل امن قائم ہو سکے۔ اِسی لئے اُنہوں نے اپنے وزیر خارجہ ڈاکٹر کمال حسین کو جب وہ لیبیا کے دورے پر تھے، ہدایت کی تھی کہ وہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ جناب عزیز احمد سے قاہرہ میں ملاقات کریں۔ اور اُنہوں نے ان مذاکرات سے بھارت کو مطلع بھی نہیں کیا۔ اِس بات کا انکشاف گذشتہ دنوں بھارت کے اخبار "اسٹیٹسمین" نے کیا۔ وہ لکھتا ہے۔

"بنگلہ دیش نے سردار سورن سنگھ کو وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کمال حسین کے دورہ لیبیا سے آگاہ نہیں کیا۔ اِس دورے کے دوران اُنہوں نے قاہرہ جاکر پاکستان کے وزیرِ خارجہ عزیز احمد سے بھی ملاقات کی تھی، جو پہلے ہی قاہرہ میں موجود تھے۔ اِسطرح ہندوستان کو کمال حسین کے دورہ اردن کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔"

عوامی لیگ کے بعض رہنماؤں کو شیخ مجیب کی اِس حکمتِ عملی سے اختلاف تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ بھارت نے ہر موقع پر اور ہمیشہ بنگلہ دیش کا ساتھ دیا ہے۔ اُسے نئی صورتحال سے باخبر کیوں نہیں رکھا گیا۔ بھارتی اخبار "اسٹیٹسمین"

قاہرہ میں کمال حسین نے عزیز احمد سے خفیہ ملاقات کی



کے مطابق بنگلہ دیش کے دو سینئر وزرا نے اسلامی سربراہ کانفرنس میں بنگلہ دیش کی شرکت کی مخالفت کی تھی۔ اُن کا اعتراض یہ تھا کہ بنگلہ دیش ایک سیکولر ریاست ہے۔ اس لئے اُسے اسلامی سربراہ کانفرنس میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اگر وہ شرکت کرنا چاہتا ہے تو بھارت کو اعتماد میں لیا جائے۔ اور شیخ مجیب کو اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے یا واپسی پر نئی دہلی میں رکنا چاہیئے۔ اسی اخبار کے مطابق شیخ مجیب نے نئی دہلی کا دورہ کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن مخالفین کا دل رکھنے کے لئے بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ٹیلی فون پر بات کی اور ایک خط بھی لکھا۔ یہ خط ڈھاکہ میں مقیم بھارتی کمشنر کو اس ہدایت کے ساتھ دیا گیا کہ اسے بلا تاخیر بھارتی وزیر اعظم تک پہنچا دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ شیخ مجیب کا ماسکو جانے کا مقصد اپنا علاج کروانے کے ساتھ ساتھ روسی رہنماؤں کو موجودہ صورتحال سے آگاہ کرنا بھی ہو۔

اگرچہ عوامی لیگ اور بنگلہ دیش کے بعض رہنما ابھی تک بھارت کی وکالت کر رہے ہیں۔ لیکن بائیں بازو کے عناصر اور عوام بھارت کی بالادستی کے بالکل خلاف ہیں بھارت اُن بنگالی ہندوؤں کو جو ۱۹۶۴ء میں مغربی بنگال یا بھارت چلے گئے تھے، دوبارہ بنگلہ دیش بھیج رہا ہے۔ اور وہ بنگلہ دیش آکر اپنی چھوڑی ہوئی جائیداد کے حصول کیلئے کوششیں کر رہے ہیں۔ بعض نے اپنی جائیداد حاصل بھی کر لی ہے۔ اس وجہ سے بنگلہ دیشی عوام میں بھارت کے خلاف نفرت تیز ہو رہی ہے۔ اور اب وہ اعلانیہ یہ کہتے ہیں کہ "مغربی پاکستانی چلے گئے تو مارواڑی آگئے ہیں" ان کا مطالبہ ہے کہ بھارت اپنے مارواڑیوں کو واپس لے جائے۔ اس رجحان کے پیش نظر بنگلہ دیش میں فرقہ وارانہ فسادات کا خدشہ بڑھتا جا رہا ہے۔

امریکہ نے اسرائیل کے تحفظ کی پالیسی میں کوئی لچک پیدا نہیں کی ـــ!

امریکہ کو تیل کی فراہمی کا فیصلہ

وی آنا کانفرنس میں تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک نے امریکہ کو تیل کی سپلائی بحال کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلے کو سعودی عرب، متحدہ عرب امارتوں، قطر، کویت، بحرین، مصر اور الجزائر کی حمایت حاصل ہے۔ البتہ لیبیا اور شام نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیبیا کے وزیر تیل جناب عز الدین مبروک نے برطانوی خبر رساں ادارے "رائٹر" کے نمائندے کو بتایا۔ کہ "ہم یقیناً امریکہ کو تیل کی فراہمی شروع نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنے تیل کی پیداوار میں اضافہ کریں گے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن مقاصد کے لئے امریکہ کو تیل کی سپلائی پر پابندی لگائی گئی تھی، وہ پورے ہو گئے؟ اس کا جواب ہمیں نفی میں ملتا ہے۔ تیل کی سپلائی پر پابندی اس لئے لگائی گئی تھی کہ امریکہ اسرائیل کا دوست تھا۔ "جنگ رمضان" میں اُس نے کھل کر اسرائیل کو فوجی و مالی امداد دی۔ عرب دشمنی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اُس کے خلاف تیل کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔ لیکن تیل کی سپلائی پر پابندی لگانے کے باوجود امریکہ نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔ وہائٹ ہاؤس ابھی تک اسرائیل کا دم بھر رہا ہے۔ مالی اور فوجی امداد دے رہا ہے۔ "جنگ رمضان" میں اسرائیل کا جو فوجی اور مالی نقصان ہوا۔ وہ امریکہ نے دو دن میں ہی پورا کر دیا۔ اسرائیل سے امریکہ کی دوستی اور دلچسپی کا اندازہ صدر نکسن کے اُس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جو انہوں نے تیل کی سپلائی کی بحالی کے فیصلے کے دو دن بعد دیا۔ بیان میں کہا گیا۔

"امریکہ، اسرائیل کی آزادی اور سالمیت کے بارے میں اپنے موقف میں کوئی لچک پیدا نہیں کر رہا ہے۔ میں واضح طور پر اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اسرائیل کے دشمنوں سے دوستی کا مطلب ہرگز اسرائیل کا دشمن بن جانا نہیں ہے۔ ہم اسرائیل کی سالمیت

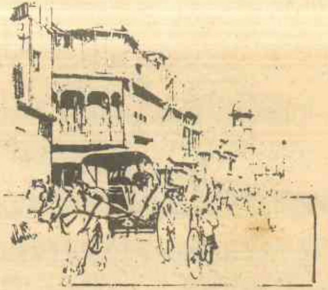
باقی صفحہ ۳۳ پر

ضروری اعلان

الفتح کو ملک کے تمام مقامات پر بیک وقت تقسیم کرنے کے لئے ہم نے نئے انتظامات کئے ہیں چنانچہ اب الفتح پورے ملک میں بدھ، جمعرات یا جمعہ کی بجائے "جمعہ" کے روز تقسیم ہوگا، قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

سرکولیشن مینجر





مکتوب پشاور - آئین

اسلم خٹک اور شیرپاؤ میں سیاسی سمجھوتے کے امکانات

صوبہ سرحد کے گورنر جناب محمد اسلم خان خٹک اور پاکستان پیپلز پارٹی سرحد کے صدر جناب حیات محمد خان شیرپاؤ کی اسلام آباد طلبی کے بارے میں یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ یہ بلاوا کسی عمومی نوعیت کا نہیں اور یہ کہ اس کے پس منظر میں اقتدار کی "پرامن" منتقلی کا وہ مسئلہ پوشیدہ ہے جو گذشتہ چند مہینوں سے یہاں سرد جنگ کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔

صوبہ سرحد کی موجودہ حکومت کے قریبی حلقوں نے چند روز قبل دبے الفاظ سے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ صوبہ سرحد کی موجودہ حکومت اور حیات محمد خان کے مستقبل کا فیصلہ یا تو یکم اپریل تک ہو جائے گا یا پھر اپریل کے پہلے ہفتے میں یقینی طور پر ہو سکے گا، اُن کے تاثرات سے جو کچھ اخذ کیا جا سکا وہ یہ تھا کہ کچھ عرصہ قبل جب حیات محمد خان شیرپاؤ کی واپسی کا غلغلہ سرد پڑا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ سرحد میں اُن کے برسر اقتدار آنے کا مسئلہ ترک کر دیا گیا تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ اگر اُن حالات میں حیات محمد خان کو صوبے کا اقتدار سونپا جاتا تو اقتدار کی اس منتقلی کو جبری بھرتی کے مترادف سمجھا جاتا اور مخلوط گروپ کے باہمی اتحاد کو ایک ایسا دھچکا لگتا جو خود حیات محمد خان شیرپاؤ کے مستقبل کے لئے مفید نہ ہوتا۔ چنانچہ اُن دنوں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اخبارات کی قیاس آرائیوں اور کچھ غیر ذمہ دار افراد کی مہم جوئی کی وجہ سے صوبے کی سیاسی فضا میں جو گرد و غبار پیدا ہو گیا تھا اُسے بیٹھ جانے دیا جائے اور اس کھچاؤ اور تناؤ کو ڈھیلا ہونا دیا جائے جو کسی سخت ردِ عمل کا جواز بن سکتا تھا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اب وہ گرد و غبار ختم ہو چکا ہے اور اب مرکزی حکومت اور صوبہ سرحد کی حکومت باہمی افہام و تفہیم سے اس بات پر آمادہ ہو چکی ہیں کہ اس مسئلے کو حل کر ہی دیا جائے۔ صوبہ سرحد کے گورنر اور حیات محمد خان شیرپاؤ کی اسلام آباد طلبی کو فیصلہ کن دورہ سمجھا جاتا ہے۔ اس دورے کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف حیات محمد خان ہی نہیں بلکہ جناب اسلم خٹک کے مستقبل پر بھی محیط ہو گا — یعنی جہاں یہ فیصلہ ہو گا کہ جناب شیرپاؤ کو سرحد حکومت کا اقتدار سونپا جائے۔ وہاں یہ بات بھی زیرِ غور آئے گی کہ خود گورنر اسلم خٹک کو صوبے کا گورنر باقی رکھا جائے یا نہیں — کہنے والوں نے تو ابھی سے پیشگوئی کر دی ہے کہ ایک نیام میں دو تلواروں کا سمانا مشکل ہو گا اور چونکہ وزیر اعظم بھٹو حیات محمد خان شیرپاؤ کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتے ہیں اس لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اسلم خٹک کو جناب شیرپاؤ پر ترجیح دیں۔

اصولی طور پر مسئلہ ترجیحی نوعیت کا بھی نہیں کیونکہ حیات محمد خان کے لئے اقتدار کا اصل منصب گورنری نہیں ہے بلکہ صوبے کی وزارت اعلیٰ ہے۔ اس لحاظ



حیات محمد خان شیرپاؤ

سے اگر کوئی ترجیحی وجہ موجود ہی ہے تو وہ جناب شیرپاؤ اور گنڈاپور کے درمیان باور کی جا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حیات محمد خان شیرپاؤ اور مرکزی حکومت کے لئے دو نوں باتیں تصفیہ طلب ہیں یعنی یہ کہ آیا حیات محمد خان شیرپاؤ، گورنر اسلم خٹک کے سائے میں کام کر سکیں گے یا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حیات محمد خان کو یہ بات کسی طرح بھی قبول نہیں کہ وہ اسلم خٹک کے نمبر ۲ کی حیثیت سے صوبے میں آئیں چنانچہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ شاید گورنر اسلم خٹک اب صوبے کے گورنر نہ رہ سکیں۔

صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اور کابینہ کے اراکین کے ٹھنڈے اور مطمئن رویّے سے جو کچھ محسوس کیا جا سکتا ہے اُس کے مطابق یہ سمجھنا یا اخذ کرنا قدرے مشکل ہے کہ اُن کو کسی تبدیلی کا سامنا درپیش ہے۔ البتہ وہ اس بات کی تردید نہیں کرتے کہ صوبہ سرحد میں بہت جلد کوئی تبدیلی ہونے والی ہے — اس کا ایک مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گورنر خٹک کی واپسی کے بعد حیات محمد خان شیرپاؤ صوبے کے گورنر بنا دیئے جائیں اور صوبے کی نمبر ایک شخصیت کے ساتھ ساتھ انہیں صوبے کی حکومت پر بھی مضبوط اختیارات دے دیئے جائیں — اور پھر کسی مناسب وقت پر جب حیات محمد خان شیرپاؤ صوبائی اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہوں تو اس پر پیپلز پارٹی کے کسی دوسرے مناسب امیدوار کو منتخب کروا لیا جائے —

یہ تمام باتیں محض قیاس آرائیوں کا ... ہیں لیکن ان کے حق میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ کئی اعتبار سے قابلِ توجہ اور اہم نظر آتے ہیں۔ لوگوں کا عام طور پر حیات محمد خان شیرپاؤ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ انتظامی امور

سرحد میں پیپلز پارٹی مضبوط ہو رہی ہے

اسلم خٹک گورنری کے عہدے سے سبکدوش ہونے والے ہیں!

کا حوصلہ افزا تجربہ نہیں رکھتے، نہ ہی وہ اسمبلی کے اندر حزبِ اختلاف کے زیرک نمائندوں کا اتنی ہی شدت سے جواب دے سکتے ہیں جتنا کہ حزبِ اقتدار کے موجودہ لاٹ میں کوئی اور دے سکتا ہے۔ اس لئے شیر پاؤ بطور گورنر زیادہ بہتر اور مؤثر طور پر کام کر سکتے ہیں۔ ایک اور خیال یہ بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وزیرِ اعظم بھٹو غالباً آئندہ دسمبر تک ملک میں نئے انتخابات بھی کروا دیں۔ انتخابات کی ضرورت سرحد اور بلوچستان کے حوالے سے شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔ اس طرح نہ صرف قومی اسمبلی بلکہ تمام صوبائی اسمبلیوں کو بھی ٹوٹ جانا ہو گا اور یوں حیات محمد خان نئے انتخابات تک صوبے کے سیاہ و سفید کے مالک و مختار رہیں گے۔ لوگ شیر پاؤ کے وزیرِ اعلیٰ بنائے جانے کے بارے میں زیادہ پُر امید اس لئے نہیں ہیں کہ اگر نئے انتخابات کی بات درست ثابت ہوئی تو حیات محمد خان اسمبلیوں کے خاتمے کے بعد ایک مرتبہ پھر بے روزگار ہو جائیں گے اور ایک مرتبہ پھر اُن کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ غالباً اسی اندیشے کے پیشِ نظر اُن کے گورنر بنائے جانے کے قیاس کو زیادہ مناسب اور یقینی سمجھا جا رہا ہے۔

خود حیات محمد خان شیر پاؤ کی جانب سے پشاور میں پیپلز پارٹی کی تنظیمِ نو۔ بلدیہ کے لئے فنڈز کے حصول اور شہریوں کے ساتھ رابطے کی استواری سے بھی لوگ یہ شبہ کر رہے ہیں کہ اُن کی تمام تر سرگرمیاں آئندہ انتخابات کیلئے ہیں۔ خان قیوم کی مصروفیات کی بھی یہی تعبیر کی جا رہی ہے اور خود وزیرِ اعظم بھٹو کے مفصل دورۂ سندھ اور اس کے بعد دورۂ پنجاب کے اعلان کو بھی انتخابات کی تیاری سے منسوب کیا جا رہا ہے۔

حالیہ دنوں میں نیپ کا جو مضبوط گروپ پیپلز پارٹی میں شامل ہوا ہے اور اس گروپ کے علاوہ مختلف سرگرم سیاسی اضلاع سے جوان اور پڑھے لکھے افراد نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کے جو اعلانات کئے ہیں۔ اُن سے بھی محسوس ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی غالباً نئے انتخابات میں نئے اور مؤثر افراد کو سامنے لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی کے موجودہ ڈھانچے میں پڑھے لکھے افراد کا تناسب مایوس کن ہے۔ حزبِ اختلاف میں البتہ قانون دانوں کی کوئی کمی نہیں اور وہ اپنے طور پر قانونی اور سیاسی اسرار و رموز سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں مگر حزبِ اقتدار کے بنچوں پر صرف ایک ہی قانون دان ہے اور وہ بھی ایسا کہ وزیرِ قانون کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اسمبلی کی کارروائی کے دوران اُن کے فرائض یا تو ایڈووکیٹ جنرل کو ادا کرنے پڑتے ہیں یا پھر وزیرِ تعلیم سکندر زمان کو کہ جو پرانے پارلیمنٹیرین ہیں، زحمت کرنی پڑتی ہے۔

گورنر اسلم خٹک اور جناب حیات محمد خان شیر پاؤ کی آمد و رفت صوبے میں کن انتظامی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہو گی، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ البتہ صوبے کی ضروریات اور سیاسی حالات کے مطابق نئے انتخابات کا اگر اعلان ہوا تو اس کا یقیناً خیر مقدم کیا جائے گا۔

---

۱۳ مارچ کو صوبہ سرحد کی اسمبلی کے پریس روم میں صوبائی وزیرِ اطلاعات کی اچانک بلائی ہوئی ایک پریس کانفرنس کے دوران پی پی آئی کے مقامی نمائندے کو جس سانحے سے دوچار ہونا پڑا تھا، پاکستانی صحافت خصوصاً سرحد کی صحافت کے نام نہاد وقار کے حوالے سے اگر اُسے نہم جوئی کے فن کے لئے غلیظ ترین گالی قرار دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہو گا مگر اس سانحے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بظاہر اس گالی کا ہدف مہم جوئی کو نہیں بلکہ صحافت کو سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے۔

۱۶ مارچ کے کراچی کے ایک انگریزی اخبار کے صفحہ ۲ کے آخری کالم کی پہلی خبر جسے پورے صفحے کے اشتہاروں پر کھڑا کر کے شائع کیا گیا تھا، اس تاثر کی حامل تھی کہ ۱۳ مارچ کو اسمبلی کے پریس روم میں پی پی آئی کے جس کارکن کو اس کی مبینہ غلط حرکتوں کی بنا پر سرزنش کی گئی تھی اُس کے لئے صوبہ سرحد کی پوری صحافت سراپا احتجاج ہے۔ اور وزیرِ اطلاعات سید مزمل شاہ کے اس غم و غصے کی مذمت کرتی ہے جس کا نشانہ پی پی آئی کے نمائندے کو بننا پڑا تھا۔ خیبر یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹو کونسل کے حوالے سے اخبار کے صفحہ ۲ پر پشاور کی ڈیٹ لائن کے ساتھ شائع ہونے والی اس خبر کی ولدیت کے بارے میں کوئی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ نہ ہی یہ بتایا گیا تھا کہ یہ خبر اخبار تک پہنچی کیسے اور پہنچائی کس نے؟ کسی اور کو حیرت ہوئی ہو یا نہ ہو خیبر یونین آف جرنلسٹس اور اُس کی ایگزیکٹو کونسل کو ضرور یہ پریشانی لاحق ہے کہ اس خبر سے متعلق اُس کا اجلاس کب ہوا تھا، کہاں ہوا تھا اور اس میں ایگزیکٹو کونسل کے علاوہ کن افراد نے شرکت کی تھی۔

صوبہ سرحد کے صحافیوں کے لئے کراچی کے ایک انگریزی اخبار میں شائع ہونے والی مذکورہ خبر درحقیقت خیبر یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹو کونسل کی گمشدگی کے اشتہار کا درجہ رکھتی ہے۔ غالباً اسی لئے اخبار میں ایسے اشتہاروں کے صفحے پر سب سے اونچا مقام دیا گیا تھا۔ اگر یہ واقعی خبر ہوتی تو اس پر اُس ایجنسی کا حوالہ بھی ضرور ہوتا جو کم از کم اپنی جھوٹی اور بے بنیاد خبروں پر بھی اپنا حوالہ دیتے ہوئے نہیں شرماتی، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خبر بھیجنے والے کو خبر سے متعلق اپنے سنگین جھوٹ کا خود بھی پورا پورا احساس تھا اور اُسے ایک عرصے کے بعد اپنے اتنے بڑے جھوٹ پر سنجیدگی سے اتنی شرم آئی کہ اپنے نام کی لاج رکھنا ضروری سمجھا۔

اُس خبر کی یتیمی نے جہاں خیبر یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کا بھرم رکھ لیا ہے وہاں معاملے کی اُس نوعیت کو بھی بہت حد تک واضح کر دیا ہے۔ جسے صحافت کی بے عزتی کے مترادف قرار دے کر پنڈی لاہور اور کراچی کے صحافتی حلقوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب یہ سوچنے اور سمجھنے کا جواز پیدا ہو گیا ہے کہ اگر یہ ایسا ہی سنگین واقعہ تھا تو پشاور سے ۱۳ مارچ کو دوسری ایجنسیوں اور نمائندوں نے اسے کیوں نہیں ریلیز کیا۔ اور تو اور خود پی پی آئی کے نمائندے نے (کہ جو گالیاں کھا کے بے مزہ ہو گیا تھا اور واک آؤٹ کر کے چلا گیا تھا) بھی اپنے واک آؤٹ اور اس کے پورے ماجرے کی رپورٹ ریلیز نہیں کروائی۔ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ صحافی جن کے حوالے سے اس واقعہ کی مذمت کی قرارداد مذکورہ اخبار میں شائع کروائی گئی ہے۔ اگر وہ پی پی آئی کی عزت و آبرو کے ایسے ہی ٹھیکیدار تھے تو انہوں نے پی پی آئی کے نمائندے کے ساتھ پریس کانفرنس سے واک آؤٹ کیوں نہ کیا تھا؟ اگر وہ وزیرِ اطلاعات کی بحوالہ مذکورہ اخبار مذمت کر سکتے ہیں تو وہ اُس پریس کانفرنس سے واک آؤٹ کیوں

ایک خبر رساں ایجنسی جماعت اسلامی کے نقش قدم پر چل رہی ہے

نہ کر سکتے تھے جس میں پی پی آئی کے ساتھ ہونیوالی "زیادتی" کو اُنہوں نے قابلِ مذمت سمجھا ؟ ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ بعد میں اُن پر اچانک وحی اُتری ہو اور صحافت کا مقام و منصب منکشف ہوا ہو ' البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اس خبر اور اُس نام نہاد سانحے میں خیبر یونین آف جرنلسٹس اور اُس کی ایگزیکیٹو کونسل کو صرف ایک فرد اور ایک ایجنسی کی اُن شرمناک حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے گھسیٹا گیا ہے جن کی بدولت صوبہ سرحد کی صحافت متعفن لاش بن کر رہ گئی ہے ۔ ایک ایسی لاش جو سرکاری مردہ خانے میں گل سڑ رہی ہو اور مردہ خانے کے باہر جس کے وارث ' میراث کے لالچ اور تعفن کی کراہت کے ملے جلے ردِ عمل کے ساتھ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوں ۔

وہ تمام اخبار نویس جو ۱۲ مارچ کو اسمبلی کے پریس روم میں وزیرِ اطلاعات کی پریس کانفرنس میں موجود تھے ۔ اِس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اُس روز پی پی آئی کی جو خبر "سانحے" کا سبب بنی تھی ۔ وہ بذاتِ خود کوئی ایسا سانحہ نہ تھا جس کے لئے پشاور کے صحافی کسی تجزدی احتجاج کی ضرورت بھی محسوس کرتے بلکہ وہ ایک ایسا سانحہ تھا ' جس کے لئے خود صحافت احتجاج کرنے پر مجبور تھی ۔ کیونکہ ایجنسی کے اُس صحافی کی وہ خبر سانحاتی خبروں کی فہرست میں پہلی اور آخری خبر نہ تھی جس کی ذمہ داری پوری صحافت قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی ۔ یہی وجہ تھی کہ جب پی پی آئی کے نمائندے نے واک آؤٹ کیا تو کسی کو بھی اُس کا ساتھ دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ' حقیقت یہ ہے کہ اُس سانحے پر افسوس کے باوجود یہ محسوس کیا گیا کہ اگر صحافتِ مرحوم زندہ ہوتی تو وہ ضرور اُن شورہ پُشتوں کے خلاف احتجاج کرتی جو اُسے کوٹھے والیوں کا فن بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں ۔

سیاسی دانشوروں کے حوالے سے صحافت اور اُس کے فن کی جو تشریح و تفسیر بیان کی جا سکتی ہے ۔ فکری اور نظری اعتبار سے اُس کے پہلوؤں کا تعین کرتے ہوئے جب کسی خاص صحافتی سانحے کا تجزیہ کیا جائے تو نہ صرف اُس کے ظاہری عوامل پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے بلکہ اُسکے باطنی پسِ منظر کا جائزہ لینا بھی لازمی ہوتا ہے ۔ پی پی آئی کے پورے فکری اثاثے اور اُس کے ماضی کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کرنا بے حد مشکل نظر آتا ہے کہ اِس ایجنسی کا صحافتی کردار کسی بھی عہد میں عوام کے مفادات کے تابع رہا ہو ' اِس کے ماضی کا جائزہ لیجئے تو ہر زمانے میں یہ ایجنسی عوام دشمن قوتوں کی آلۂ کار ' معاون و مددگار دکھائی دی ہے ۔ اپنے داخلی اور خارجی مفادات کی بنا پر یہ خبر رساں ایجنسی ' خبر رسانی سے زیادہ ایسے فرائض انجام دیتی دکھائی دی ہے جو مخصوص مفادات کے حامل طبقوں کے تحفظ کے لئے عوام الناس میں کنفیوژن پیدا کر سکیں ۔ صحافت کو بادشاہ گری کا فن بنانے اور اِسے مہذب قسم کی بدمعاشی اور غنڈہ گردی کا لقب دلوانے میں سامراجی گماشتوں نے اب تک پاکستان میں جو مہمیں سر کی ہیں نہ اتنی جانکاہ اور ہولناک ثابت ہوئی ہیں کہ سچ پر جھوٹ اور زندہ پر مردے کا گمان ہونے لگا ہے ۔

اِس سے بڑا سانحہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے صحافت کے معروضی پہلوؤں اور اس کے مثبت کردار کے بارے میں سوچنا تک چھوڑ دیا ہے اور جب بھی اُنکے منہ کا ذائقہ خراب ہوتا ہے یا وہ گالی دینے پر مجبور ہوتے ہیں تو پوری صحافت کو گالی دے ڈالتے ہیں ۔ وہ اپنی گالی سے کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیتے ۔ صحافت کے اِس المیئے کا ہی یہ شاخسانہ ہے کہ جب پشاور میں پی پی آئی کے نمائندے کو صوبہ سرحد کے وزیرِ اطلاعات نے سرزنش کی تو اُس نے وزیرِ اطلاعات کی طرف سے برتی جانے والی تخصیص کے باوجود ازراہِ تکلف اُن صحافیوں یا صحافی برادری کو بھی اپنی غلاظت میں شامل کرنے کی سعی کر ڈالی جو چشم دید گواہ ہونے کے باوجود پی پی آئی کے مقدر میں شامل نہ ہوئی تھی ۔

ہم بدقسمتی سے اگر صحافت اور اہلِ صحافت کو معصوم عن الخطا سمجھتے ہوئے یا صحافت کو آسمانی اور الہامی فرقہ سمجھتے ہوئے فرقہ داریت پر یقین رکھنے والے ہوتے تو آنکھیں بند کر کے کہہ سکتے تھے کہ وزیرِ اطلاعات پی پی آئی کی جھوٹی خبر کی اشاعت پر انعام دیتے ۔ خاص طور پر اسلئے بھی کہ وہ ٹرسٹ کے مقامی اخبار میں پی پی آئی کے بجائے اے پی پی کے نام سے شائع ہوئی تھی ۔ یعنی چھپتے چھپتے اس کی جنس میں تبدیلی ہو گئی تھی ' ہم وزیرِ اطلاعات اور صوبہ سرحد کی حکومت کو یہ مشورہ بھی دیتے کہ پی پی آئی کے نمائندے کی خواہش کے مطابق وہ اقتدار سے مستعفی ہو جائے ۔ اور آئندہ حکومت کا مسئلہ پی پی آئی کے معظم علی پر چھوڑ دیں کہ وہ جسے چاہے حکومت سونپ دے ۔ مگر افسوس ہم صحافت کے بارے میں ایسی کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ۔ ہم صحافت کو نہ تو ایسی صفاتِ حمیدہ کا سزاوار سمجھتے ہیں نہ گناہگار ' ہمارے نزدیک صحافت یا کسی صحافی پر یہ ذمہ داری قطعاً عائد نہیں ہوتی کہ اُجرتی قاتلوں کی طرح دوسروں کی بندوق اپنے کاندھے پر رکھ کر چلائے ۔ نہ ہی ہم کسی ایسے صحافی کو اپنی حمایت اور اپنے تعاون کا مستحق سمجھتے ہیں ۔ جو اپنی برادری کو اپنی "نیک نامیوں" میں تو شریک نہ کرتا ہو مگر اپنے گناہوں کا بوجھ پوری برادری پر ڈالتا ہو ۔

پی پی آئی کے نمائندے کو اُس کی خصوصی سرگرمیوں کی بنا پر مرکزی سیکرٹری اطلاعات نے بھی پشاور کے ایک مجمع میں گالیاں دی تھیں ' صحافی اس مجمع میں موجود تھے مگر اُس وقت پی پی آئی کے نمائندے کو یہ گالیاں اتنی میٹھی لگی تھیں کہ نہ تو واک آؤٹ کی ضرورت محسوس کی نہ ڈان میں اشتہار چھپوانے کا خیال آیا ..... احتجاجی قراردادوں کے حوالے سے خیبر یونین آف جرنلسٹس اور پی پی آئی کچھ اتنی لازم و ملزوم دکھائی دیتی ہیں کہ اس میں شامل افراد اکثر و بیشتر یونین کو پی پی آئی یونین آف احتجاج سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

صوبہ سرحد کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر شفیع اللہ خان کے خلاف بھی پی پی آئی کو اسقاطِ حمل کی ضرورت اسمبلی ہی کے پریس روم میں محسوس ہوئی تھی ' پی پی آئی کے نمائندے کی خواہش تھی کہ چونکہ آئی جی پولیس کے رویے کے خلاف انہیں فٹ بال کے ایک ٹورنامنٹ سے واک آؤٹ کرنا پڑا تھا ' اس لئے اُن کے خلاف قراردادِ مذمت پاس کی جائے ۔ پی پی آئی کے نمائندے نے یہ نہ بتایا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا ' کیوں ہوا ' کیسے ہوا اور ظاہری

باقی صفحہ ۲۹ پر

پیپلز پارٹی آئندہ
انتخابات میں نئے
اور موثر افراد کو
سامنے لانا چاہتی ہے



یوم پاکستان کے موقع پر

وزیراعظم بھٹو

کا پیغام

ہم اس سال یوم پاکستان اس یقین اور اعتماد کے ساتھ منا رہے ہیں کہ گزشتہ سال یوم پاکستان منانے کے بعد سے اب تک قوم کو تین شاندار کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں جن میں سے ایک مستقل آئین کا نفاذ ہے، پچیس سال کی مسلسل ناکامی کے بعد آخر کار ہم نے ایک مستقل آئین حاصل کرلیا ہے اور منظم سیاسی زندگی کی ٹھوس بنیاد رکھ دی۔ اس آئین میں یہ ضمانتیں دی گئی ہیں کہ پاکستان میں کبھی عدم استحکام پیدا نہیں ہوگا۔ آمرانہ حکومت قائم نہیں ہوگی اور قانون میں تعطل پیدا نہیں ہوگا جس کی وجہ سے پاکستان کا سیاسی مستقبل وجود میں آنے کے فوراً بعد تباہ ہوگیا۔ مستقل آئین میں اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ قومی معاملات میں عوام کو شرکت سے محروم کرنے کے لئے کسی قسم کا گٹھ جوڑ یا محلاتی سازشیں ہرگز نہیں ہونے دی جائیں گی، مرکز کا کمزور ہونا اور صوبائی عصبیت کا بڑھنا ہی ماضی میں کثیر الانسانی اسلامی ملکوں کے زوال کا باعث بنا لیکن ہمارے آئین میں ہمارے معاشرہ کو اس برائی سے تحفظ حاصل ہے، دوسرے بھارت کی قید سے ہمارے جنگی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد طویل نظر بندی کے بعد وطن واپس آگئی ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ باقی جنگی قیدی بھی بہت جلد اپنے گھروں کو واپس آجائیں گے' یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ ہمارے لئے زبردست تباہی کا باعث بنی لیکن یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ ہم نہ صرف حملہ آور فوج کے قبضہ سے اپنا علاقہ واپس لینے میں کامیاب ہو گئے بلکہ اصولوں پر کسی قسم کی سودے بازی کے بغیر اپنے فوجیوں اور شہریوں کو واپس لے رہے ہیں۔ ہمارے لئے اس حقیقت میں ایک اہم سبق موجود ہے کہ ایک گمراہ کن ٹولے نے اپنے آپ کو تباہ کیا اور ملک کو شکست دلائی، جبکہ عوامی حکومت نے ملک کی سلامتی کو مضبوط بنایا اور اپنا وقار اور اعتماد پیدا کیا۔ تیسرے ہمارے ملک نے حال ہی میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کے سب سے بڑے اجتماع کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ اس تاریخی اجتماع نے پرانے اسلامی بھائی چارہ کو حقیقت کا روپ دیا۔ اسلامی کانفرنس سے اس بات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا کہ پاکستان ایسا ملک نہیں ہے جس کو بین الاقوامی برادری میں اس کے حقوق سے محروم کر دیا جائے' یا اس کو ثانوی مقام دیا جا سکے' یا اس کو کسی کا ماتحت بنایا جائے۔ حتیٰ کہ ہمارے ناقدین بھی نئے پاکستان کا اعتراف کرتے ہیں' علاوہ ازیں قرار دادِ لاہور جس میں برصغیر کے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کی ضمانت دی گئی ہے اسے اب اعلان لاہور کا نام دیا گیا ہے جس میں حق خود ارادیت کے چارٹر، صحیح معنوں میں سیاسی آزادی اسلامی دنیا کے فنی انحصار اور اقتصادی تعاون کی عکاسی ہوتی ہے اور یہ اعلان آج عالمی سیاست میں متحرک قوت کا مظہر ہے آج جبکہ ہم یوم پاکستان منا رہے ہیں۔ ہمیں خداوند قدوس کی بارگاہ میں سربسجود ہوجانا چاہیئے جس نے ہماری خواہشات کی تکمیل کے لئے ہمیں اس قابل بنایا ہے۔ عوامی حکومت کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ کسی بات سے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ ہمیں لاتعداد اقتصادی مسائل کا سامنا ہے۔ ملک کی سلامتی کو مضبوط بنانے اور اس کو تخریب کاری سے محفوظ رکھنے کا کام ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا ہے' چند ہمسایہ ملکوں کے ساتھ تعلقات تشویش کا باعث ہیں۔ ہم ان شکوک و شبہات میں گھرے ہوئے ہیں کہ آیا یہ ہمسایہ ملک ہمارے ساتھ عدم مداخلت بین الاقوامی سمجھوتوں کے احترام طاقت کے استعمال اور تخریبی حملوں سے اجتناب کی بنیاد پر بقائے باہمی کے لئے تیار ہیں، تاہم ہم وہ واحد قوم نہیں ہیں، جس کو یہ مشکلات درپیش ہیں۔ گرانی کا مسئلہ عالمگیر ہے اور ہم خود کو افراط زر کے عالمگیر دباؤ سے علیحدہ نہیں رکھ سکے، لیکن جہاں تک ممکن ہو سکے گا ہم اس کے اثرات اپنی معیشت پر سے کم کرنے کی کوشش کریں گے اور عوامی حکومت اس کے لئے اپنی جانب سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ تخریب کاری کے ٹھکانے جن سے ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہے۔ آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں اور ہم اس کے مکمل خاتمے کے خواہش مند ہیں۔ ہم نے واضح کر دیا ہے کہ ہم اپنے پڑوسی ملکوں کے خلاف برے عزائم نہیں رکھتے اور ہم اپنے اور انکے مفادات کے لئے ان کے ساتھ سازگار حالات پیدا کرنے کیلئے تعاون کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔

یوم پاکستان مسلسل کوششوں کی علامت اور یادگار ہے، محنت اور کوشش اس کا ایندھن ہے' انہماک اس کا محرک ہے اور مادی اور ثقافتی اعتبار سے خوشحال آزادی اس کی منزل مقصود ہے ہمیں آج کے دن عہد کرنا چاہیئے کہ آئندہ بارہ ماہ کے دوران ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھیں گے اور ایسا طریقہ کار اپنائیں گے، جس سے چونتیس سال قبل لاہور قرارداد منظور کرنے والوں کو یقین ہو جائے کہ ان کے تصور نے حقیقت کا روپ اختیار کرلیا ہے۔

امریکہ، کانگریس کا ہمدرد اور متحدہ ہندوستان کے حق میں تھا

ذوالفقار علی بھٹو کے قلم سے



پاکستان کو عالمی امن کے قیام میں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا

ایک ایشیائی اور ترقی پذیر ملک ہونے کے سبب، پاکستان کو عالمی صورتحال کے حوالے سے ترقی پسندی اور روشن خیالی کے ایسے قومی مفادات کی بنیاد پر اپنی خارجہ پالیسی کو مرتب کرنا پڑتا ہے۔ جن میں عالمی امن و انصاف کی بھرپور خواہش ہو۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ایک ایسی مملکت ہے جس کا اپنا نظریہ ہے۔ برِصغیر کے مسلمانوں کے لئے پاکستان خدا کی طرف سے پیدا کئے ہوئے جذبے کا عکس ہے اور حقِ خود ارادی کے ذریعے حقیقت میں منتقل کیا ہوا انصاف، اور مساوات کا تصوّر ہے۔ اپنی نوعیت کے مطابق پاکستان کی خصوصی بین الاقوامی ذمہ داریاں ہیں اسے لازماً ایسی حیثیت اختیار کرنی پڑتی ہے جس سے یہ عالمی امن کے استحکام اور تمام قوموں اور تمام لوگوں کے لئے مساوات کے حصول کی خاطر اپنی حقیقی ذمہ داریاں پوری کرنے کا اہل ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ حیثیت اسے خود اپنے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی اجازت بھی دے۔

غیر ملکی تسلّط ختم کرنے اور مساوات حاصل کرنے کے جذبے سے سرشار ہو کر برِصغیر کے مسلمانوں نے ایک علیحدہ مملکت کے لئے جدوجہد کی اور حصولِ پاکستان میں کامیاب ہوئے۔ اگرچہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ابھی تک برِصغیر

برطانوی دورِ حکومت میں قومیت کا تصوّر اُبھرا

کی تقسیم پر اظہارِ تاسف کرتے ہیں۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ تقسیم کے بغیر ماقبل تقسیم ہندوستان میں بسنے والے کسی بھی علاقے کے مسلمان ان اقدار کی حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوتے جنہیں وہ اعلیٰ ترین خیال کرتے ہیں اور تسلّط سے آزاد دنیا کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔

عملی طور پر تمام ہندوستان زمانۂ قدیم میں مہاراجہ اشوک کے عہد میں متحد تھا اور بعد میں مغل حکومت کے نقطۂ عروج کے زمانے میں ایک ہوا، جب اورنگ زیب کا فرمان برِصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اتحاد کو مسلّط کیا گیا تھا۔ مختلف زبانوں والا ہندوستان ہمیشہ متصادم ثقافتوں کے وسیع تنوع کا حامل رہا ہے جسے شہنشاہی نظاموں نے یکجا کئے رکھا۔ یہ ایک واحد قومیّت کے سرچشمے سے اُبلنے والے تمدن اور یگانگت کی بات تھی۔

درحقیقت قومیت یا ملیت کا تصوّر، جیسا کہ ہم اسے سمجھتے ہیں، بہت بعد میں روپذیر ہوا۔ برطانیہ نے بھی ہندوستان کو کچھ ویسا ہی اتحاد دیا۔ جیسا ان سے پیشتر اشوک اور اورنگ زیب نے اس ملک پر مسلّط کیا تھا۔ زمانۂ مابعد کی یہ یگانگت بے میل قسم کی تھی۔ کیونکہ ملک کے بعض حصّوں پر تو براہِ راست حکمرانی تھی اور کچھ حصّوں پر راجے نواب حکومت کرتے تھے، جو معاہدوں کے ذریعے تاجِ شاہی کے ساتھ وابستہ تھے۔ اس کے باوجود انگریزوں ہی کے دورِ حکومت میں ہندوستانیوں کے شعور میں قومیّت کے تصوّر کی نمو شروع ہوئی۔ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہ اس پودے کی جڑیں پوری طرح مضبوط ہو جائیں گی، تاہم برطانوی راج نے قومی شعور کی حس کو بیدار کیا تو یہ شعور ایک واحد ناقابلِ تقسیم ذات کا نہ تھا بلکہ دو طاقتور مختلف قوموں کا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کا اپنا جدا مذہب اور اپنی الگ ثقافت اور امنگیں تھیں۔ اس برِصغیر کی برطانوی تسخیر کے بعد یہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے تک برطانیہ کی ایسی مملکت رہا جس کی اس نے بڑی تندہی سے حفاظت کی۔ فرانسیسیوں اور پرتگیزیوں کے سوا، جن کے چھوٹے چھوٹے مقبوضات تھے۔ برِصغیر کا ساحل دوسرے ممالک کے لئے بالکل بند کر دیا گیا۔ اس کے ایک سرے پر ہمالیہ کے پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے تھے اور ملک کی علیحدگی کو سمندروں کی سی کارگری کے ساتھ برقرار رکھتے تھے۔



گاندھی جی امریکی امداد کے اثرات سے خائف تھے—!!

ہمالیہ کے اس پار جو کچھ بھی روایتی تعلقات موجود تھے انہیں فاتحین نے تاجِ برطانیہ کے اس "درخشاں ترین ہیرے" کی علیحدگی کی تکمیل کے لئے منقطع کر دیا۔ برطانویوں نے ہندوستان کو ایک اسرار اور توہمات کی سرزمین کے روپ میں دیکھا۔ جس میں عجیب و غریب، متضاد، مختلف، مذاہب اور آپس میں لڑنے بھڑنے والے سردار تھے۔ یہ سفید فام آدمی کا دنیا کو مہذب بنانے کے مشن کا سب سے بڑا بوجھ تھا۔ ہندوستان سے دوسری نوآبادیاتی طاقتوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اپنے انسان ساز کارِ خیر کی تکمیل کے لئے برطانوی قوم تنہا قدم بڑھانے لگی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کا، جسے "غدرِ ہند" کہا جاتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا جذبہ بربریت کے ساتھ دبا دیا گیا۔ یہ جوابی کارروائیاں اتنی شدید تھیں کہ سامراجی برطانیہ کے پروانۂ اختیار میں، اس کے بعد کئی عشروں تک کسی عوامی بغاوت سے خلل نہ پڑا۔ تحریکِ خلافت برطانیہ کے تسلط کے خلاف دوسری سچی ہمہ گیر بغاوت تھی۔ اس مسلم تحریک کو گاندھی جی نے ہوشیاری کے ساتھ کانگرس کی طرف سے قومی آزادی کا مطالبہ کرنے کے لئے استعمال کیا۔ کئی سال تک گاندھی جی کی قابل رہنمائی میں میدان کانگرس کے ہاتھ رہا۔ آزادی کی جدوجہد اور انڈین نیشنل کانگرس ہم معنی اصطلاحات بن گئیں۔ اس کے کافی عرصے بعد جناب محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے حقِ خود ارادی کی تحریک کا آغاز کیا۔ انگریز تقسیم کے لئے مسلمانوں کے مطالبے کے خلاف تھے۔ حصولِ پاکستان کی کشمکش میں جناح کو، جو اب قائدِ اعظم کہلانے لگے تھے۔ انگریزوں اور انڈین نیشنل کانگرس کی دوہری مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا نسخہ والا نوآبادیاتی دورِ عصرِ نو کی جدید استعماریت کے لئے جگہ خالی کر رہا تھا جس کو نئے کلیئے "متحد رکھو اور حکومت کرو" کے نفاذ کی ضرورت تھی۔ بدلتے ہوئے حالات اور اس کے ہم نظیر جدید استعماریت کے تقاضوں کو زیادہ بڑی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے اور کمیونزم کی دخل اندازیوں سے اپنا دفاع کرنے کے لئے برصغیر کی وحدت کی ضرورت تھی۔ یہ خدشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ برصغیر کو تقسیم کرنا "تقسیم کر کے کھونے" کے مترادف ہوگا۔ اور اس طرح خام مال کی وسیع منڈیوں تک رسائی میں رکاوٹ پیدا ہوگی، اور روس کی برصغیر اور بحرِ ہند کو اپنے قابو میں رکھنے کی دیرینہ خواہش کے خلاف اس خطے کا دفاع ۔۔۔ ہو جائے گا۔ اس تشخیص کی بناء پر برطانویوں نے آخر دم تک تقسیمِ ہند کے خلاف کوشش کی۔

اگر برطانیہ ہندوستان کو ایک متحد مملکت کی صورت میں چھوڑ کر جاتا تو آج برصغیر میں چار پانچ قومی مملکتیں ہوتیں۔ اس وقت معاملہ ہندوستان کو ایک متحدہ ملک کی صورت میں یا دو حصّوں کی صورت میں چھوڑنے کے درمیان انتخاب کا نہ تھا بلکہ ہندوستان کو دو قوموں کے درمیان تقسیم کر کے چھوڑنے کا یا اسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کم از کم چار پانچ مملکتوں میں بٹ جانے کے لئے چھوڑنے کا۔ پاکستان کی تخلیق نے بھارتی قومیّت کو معیّن شکل بنانے میں مدد دی ہے۔ اگر ہندوستان میں پاکستان کے خلاف نفرت نہ پھیلی ہوتی ہوتی تو اس کے لئے مختلف زبانیں بولنے والے صوبوں کو الگ ہو جانے سے روکنا بہت مشکل ہوتا۔ اب بھی صورت یہ ہے کہ پاکستان کے خلاف عناد کے باوجود ہندوستان اپنی غیر معمولی وحدت کو بڑی مشکل سے قائم رکھ پا رہا ہے یہ بڑی اہمیت کی بات ہے اور بیرونی طاقتوں کو چاہیئے کہ وہ اس کو ہندوستان

دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھری

پاکستان کے درمیان کارگر مفاہمت کرانے کی کوشش کرتے وقت یاد رکھیں۔ "کمیونسٹ خطرے" کا زیادہ مؤثر مقابلہ کرنے کے لئے ایک ناقابلِ تقسیم برصغیر کو وجود میں لانے کی کوشش میں ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے ٹکڑے ہر طرف کو بکھر کر بعض عالمی طاقتوں کے مقاصد کو برباد کر دیں۔ صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کو جذب کرنے کی کوشش موجودہ بھارت کی یگانگت کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہے، ایسے انتشار سے تمام وہ تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے جن سے پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کر کے مغربی طاقتیں بچنا چاہتی ہیں۔

وہ لوگ جو پاکستان کی روح کو نہیں سمجھتے اور جن کے نزدیک قومیت کا تصوّر رسمی علاقائی ملحوظات پر مبنی ہوتا ہے، اس جذبے کی تہہ تک نہیں پہنچتے جس نے تحریکِ پاکستان کو جنم دیا۔ جس کی جدوجہد مساوات میں مسلمانوں نے آزادی کو وحدت پر ترجیح دی۔ اس قسم کے لوگ پاکستان کے اقتصادی اور دفاعی قوتِ برداشت بلکہ اس کے کل وجود پر جھٹ فتویٰ صادر کرتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس ملک پر ایک فاصلے سے نظر ڈالتے ہوتے اور اس کے بنیادی اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ اگر یہ ایک برصغیر ہی رہا ہوتا تو ان کے عالمی اغراض کہیں زیادہ قائم رہتے۔ وہ اس بات کا اندازہ نہیں کر پاتے کہ پاکستان کا یہی وجود برصغیر کے دوسرے حصّے پر ایک ناقابلِ تقسیم قوم کی صورت میں متوازن ہے، بھارت کی وحدت کا باعث ہے، اگر پاکستان کی متوازن میزان کا جھکاؤ ایک یا دوسری طرف ہو جائے تو ہندوستان کا توازن بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایسے بیرونی ممالک پر جو برصغیر کی دو قوموں کے درمیان تقسیم کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں، ایسا انجام کہیں زیادہ ناگوار گزرے گا۔

پاکستان کے مسائل اور اس کی داخلی حیثیت کا مفصّل اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد برصغیر میں رونما ہونے والے واقعات کی نشوونما اور دونوں ملکوں کی طرف بڑی طاقتوں کے رجحان پر دوبارہ غور کیا جائے، اس کے لئے مناسب نقطۂ آغاز برصغیر کی طرف بڑی طاقتوں کا وہ رویّہ ہے جو انہوں نے اس وقت اختیار کیا تھا جب ہندوستان اور پاکستان آزادی کی دہلیز پر کھڑے تھے۔

جرمنی کو تباہ کیا جا چکا تھا اور فرانس، اپنی شکست کی خفت اٹھا چکنے کے بعد، فوری طور پر دوبارہ عالمی اہمیّت حاصل کر لینے کے قابل نہ تھا۔ اتحادی طاقتوں کی امداد سے وہ جنوب مشرقی ایشیاء میں اور افریقہ میں اپنی نوآبادیات کی بازیابی کا خواہش مند تھا چین، جاپان کے ہاتھوں بُری طرح زخم خوردہ تھا۔ چیانگ کائی شک نے اس کے باوجود ہندوستان کی آزادی میں دلچسپی لی تھی۔ لیکن برطانیہ نے اسے دھتکار دیا تھا، کیونکہ وہ اس کی ان کوششوں کو اپنی سلطنت کے معاملات میں خواہ مخواہ کی مداخلت سمجھتا تھا جنرلیسیمو چیانگ کائی شک اور ان کی بیوی نے ہندوستان آ کر ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات

انگریز
تقسیم ہند کے
مطالبے کے
خلاف تھے!

کتے جس کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۴۲ء کو پنڈت نہرو نے قدیم ہندی اور چینی تہذیبوں کی باہمی قربتوں کا ذکر کیا اور ایک بڑے وفاق کی تجویز کا خاکہ پیش کیا، جو ہندوستان، چین، ایران اور چند اور چھوٹے ملکوں کے ملنے سے بنے اور جس کا مقصد ان ممالک کی آزادی کا قائم رکھنا اور عالمی امن کے قیام کی امداد ہو۔ مسٹر چرچل نے جنرلیسیمو اور ان کی بیوی کے دورۂ ہندوستان کا بیان ذیل کے الفاظ میں کیا۔

"ان کے دورے کا مقصد یہ تھا کہ جاپان کے خلاف ہندوستان کی رائے عامہ کو مجتمع کیا جائے اور جاپان کی شکست کے ایشیا پر مجموعی اور چین اور ہندوستان پر خاص طور پر پیدا ہونے والے اثرات پر زور دیا جائے۔ ہندوستان کے پارٹی لیڈروں نے اس موقع کو جنرلیسیمو کے توسط سے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کیا تاکہ وہ کانگرس کے مطالبات کے سامنے جھک جائے"

"جنگی کابینہ شہنشاہ معظم کی حکومت کے نمائندوں اور میسرز گاندھی و نہرو کے درمیان ایک بیرونی ملک کے سربراہ کے از خود غیر جانبدار ثالث بن کر مداخلت کرنے کی کوشش سے متفق نہیں ہو سکی۔"

(دی سیکنڈ ورلڈ وار، ۱۹۵۱ء جلد ۴ ص ۱۸۳)

مسٹر چرچل نے جنرلیسیمو کو رضامند کر لیا کہ وہ اس معاملے پر ایسے وقت میں جب اتحاد کی بے حد ضرورت تھی زور نہ دیں۔

سوویت یونین جنگ سے ایک فتح مند بڑی طاقت کی صورت میں ابھری تھی، لیکن اس کا برّصغیر کے ساتھ عملاً کوئی

مسلم تحریک کو گاندھی جی نے قومی آزادی کے مطالبہ کے لئے استعمال کیا

رابطہ نہ تھا۔ اور یہاں کی سیاسی صورت حال سے اس کی واقفیت نامکمل تھی۔ مزید برآں اس کا مشرقی یورپ اور جرمنی کے مستقبل سے زیادہ تعلق تھا۔ ایشیا میں اس کے جو کچھ اغراض تھے وہ زیادہ تر ایران کے شمالی حصوں، جاپان اور کمیونسٹ پارٹی اور کومنتانگ کی باہمی داخلی کشمکش اقتدار میں گھرے ہوتے چین تک محدود تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوویت یونین کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کچھ دوسرے معاملات ایسے تھے جو اولین توجہ کے طلب گار تھے۔ پہلی ضروری بات یہ تھی کہ سرد جنگ کی آزمائش کا سامنا کیا جائے جس کا مدار یورپ ہی تھا۔ برطانیہ نے جنگ جیت لی تھی، لیکن اس میں اس کی طاقت بہت کم ہو گئی تھی، کچھ عرصہ اور اس کو مغرب کے ترجمان کی حیثیت، طاقت کے حقائق کی بنا پر نہیں تاریخی اسباب کی وجہ سے حاصل رہی۔ جنگ کے خاتمے سے بہت پہلے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ برطانیہ کو پیچھے چھوڑ کر مغرب کی قیادت کی ذمہ داری سنبھال لے گا۔ پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے، ۱۹۱۳ء میں مسٹر والٹر ایچ پیج سفیر امریکہ متعینہ برطانیہ نے صدر ولسن کو لکھا تھا:

"دنیا کا مستقبل ہمارا ہے... انگریز اپنا اصل سرمایہ خرچ کر رہے ہیں... اب سوال یہ ہے کہ ہم دنیا کی قیادت کے سلسلہ میں جو جلد ہی ہمارے ہاتھ آنے والی ہے کیا طرز عمل اختیار کریں۔ اور انگریزوں کو ہم جمہوریت کے بلند ترین فوائد کے لئے کیوں کر استعمال کریں۔"

(رابرٹ جے، ہینڈرک "دی لائف اینڈ لیٹرز آف والٹر ایچ پیج" ۱۹۲۳ء جلد ۱ ص ۱۴۴)

۱۹۲۰ء میں ایک مصنف لڈویل ڈینی اپنی کتاب "امریکہ کونکرز برٹین" (امریکہ، برطانیہ کو فتح کرتا ہے) میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ۔

"کبھی ہم برطانیہ کی نوآبادی تھے، اب آگے چل کر وہ ہماری نوآبادی ہو گی، نام کی نہیں مگر حقیقتاً" مشینوں نے برطانیہ کو دنیا پر بالادستی عطا کی، اب بہتر مشینیں امریکہ کو دنیا اور برطانیہ پر فوقیت دلا رہی ہیں... امریکہ کے خلاف اب برطانیہ کی کیا حیثیت ہے؟ ساری دنیا کی کیا حیثیت ہے؟"

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ریاستہائے متحدہ کی فوقیت میں کسی قسم کا شک نہیں رہ سکتا تھا۔ تاہم چند سال تک امریکہ مشورے اور سفارتی اقدامات کے لئے برطانیہ کا سہارا لیتا رہا اور کچھ عرصے تک برطانیہ امریکہ کے لئے وہ کچھ بن گیا جو یونان روم کے لئے رہا تھا۔ اس تغیراتی دور میں برطانیہ ہندوستان میں اپنی سلطنت کا قصہ چکا رہا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ کا ہندوستان کے حالات سے کوئی واضح تعلق نہ تھا۔ وہ ان کے متعلق معلومات اور مشورے کے لئے برطانیہ پر بھروسہ کرتا تھا۔ یہ سچ ہے۔ کہ ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کو آزاد دیکھنے کا متمنی تھا۔ اور بعض موقعوں پر ہندوستان کی آزادی کا جلد از جلد اعلان کرنے کے مطالبوں سے برطانیہ کو برافروختہ بھی کر چکا تھا' یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ امریکہ تقسیم کے بذات خود خلاف تھا، لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک متحدہ ہندوستان کے حق میں تھا اور کانگرس کے غیر منقسم ہندوستان کے مطالبے سے ہمدردی رکھتا تھا۔ امریکہ خطرات کے ان برطانوی تخمینوں سے بھی جو اس نے منقسم ہندوستان کی وجہ سے مغرب کے مفادات کو لاحق ہونے کے متعلق لگائے تھے متفق تھا، لیکن ہندوستان کی سیاسی صورت حال کی تفصیلات اور باریکیوں سے اتنا واقف نہیں تھا کہ وہ تقسیم کے متعلق کوئی واضح مؤقف اختیار کر سکے۔ تاہم ریاست ہائے متحدہ اس ملک کی سیاسی اور جغرافیائی اہمیت سے خوب واقف تھا اور وہ چین اور ہندوستان کو مغرب کے دو مضبوط قلعے بنتے ہوئے دیکھنے کی توقع بھی رکھتا تھا۔ انڈین کانگرس کے رہنماؤں کو پانچویں عشرے کے آغاز اور درمیانی حصے میں کئی تجویزیں پیش کی گئیں' اور ۲۱ جولائی ۱۹۴۱ء کو اعلان کیا گیا کہ ریاست ہائے متحدہ اور ہندوستان کے درمیان نمائندوں کا تبادلہ ہو گا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں مسٹر چرچل کے دورۂ واشنگٹن کے دوران مسٹر روزویلٹ نے ان کے ساتھ ہندوستان کے مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کی۔ بعد ازاں فروری ۱۹۴۲ء کے اختتام کے قریب صدر روزویلٹ نے ایوریل ہیریمین کو ہدایات دیں کہ وہ برطانوی حکومت اور ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کے درمیان کسی تصفیے کے امکانات کے متعلق مسٹر چرچل سے بات کریں۔ مسٹر ہیریمین کی آمد کے جواب میں مسٹر چرچل نے ۴ مارچ ۱۹۴۲ء کو صدر روزویلٹ کو لکھا:

"ہم اس امر پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ آیا جنگ کے بعد ڈومینین سٹیٹس کا اعلان جس

پاکستان کی تخلیق نے بھارتی قومیت کی تشکیل میں مدد دی

ہیں اگر خواہش کی جاتے تو علیحدگی کا حق بھی ہو، اس نازک موقع پر کیا جاتے! ہمیں ہرگز کسی وجہ سے بھی مسلمانوں کے ساتھ قطع تعلق نہیں کرنا چاہیئے، وہ دس کروڑ کی تعداد میں ہیں اور وہی فوج کے ان اہم عناصر کو فراہم کرتے ہیں جن پر حالیہ جنگ میں ہمیں بھروسہ کرنا ہے، ہمیں سوا تین تا چار کروڑ اچھوتوں کی طرف بھی اپنے فرائض کا خیال رکھنا ہے اور ہندوستان کی ریاستوں کے ساتھ اپنے معاہدوں کا بھی، تقریباً آٹھ کروڑ کی آبادی۔ ظاہر ہے کہ ہم ہندوستان کو حملے سے سامنے کے وقت بدنظمی کا شکار نہیں بنانا چاہتے ہیں۔"

(چرچل، متذکرہ بالا کتاب ص ۱۸۵)

اس کے کچھ عرصے کے بعد جنوب مشرقی ایشیا۔ میں جاپانیوں کی تیز پیش قدمی نے صدر روز ویلٹ کو ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں مسٹر چرچل پر زیادہ زور ڈالنے پر اکسایا۔ مسٹر چرچل نے ریاست ہائے متحدہ کے دباؤ کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کیا ہے ۔:

"ریاست ہائے متحدہ نے جاپانیوں کی پیش قدمی مغرب کی طرف پھیل جانے کے ساتھ ہی ہندوستانی معاملات میں بڑھتی ہوئی براہ راست دلچسپی کا اظہار کیا تھا، عالمگیر جنگ کی حکمت حرب کے ساتھ امریکہ کے سروکار نے اس کو ایسے سیاسی معاملات سے بھی بھڑا دیا تھا جن کے متعلق اس کی آرا محکم، تجربہ کم تھا۔ اب جب کہ جاپانی ہندوستان کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہے تھے، ریاست ہائے متحدہ کی حکومت نے ہندوستان کے معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار اور مشورہ دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

(چرچل، متذکرہ بالا کتاب، ص ۱۸۵)

۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو صدر روز ویلٹ نے مسٹر چرچل کو ہندوستان کے سوال پر اپنے خیالات ارسال کئے۔ ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کے مبادیات کی مثالیں دیتے ہوئے مسٹر روز ویلٹ نے رائے دی کہ:۔

"ایک ایسی حکومت قائم کی جاتے جو ہندوستان کی عارضی حکومت کہلاتے، جس کی سربراہی ایک چھوٹی سی نمائندہ جماعت کر رہی ہو جو مختلف ذاتوں، پیشوں، مذاہب اور جغرافیائی اکائیوں پر مشتمل ہو۔ اس جماعت کو عارضی مستراتی (ڈومینین) حکومت قرار دیا جاتے۔ صدر روز ویلٹ کی تجویز کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اسے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کا فریضہ سونپا جاتے جو تمام ملک کے لئے ایک زیادہ مستقل حکومت کے متعلق غور کرے۔"

(چرچل، متذکرہ بالا کتاب، ص ۱۸۹)

ہندوستان میں کرپس مشن کی آمد کے موقع پر صدر روز ویلٹ کے ہندوستان میں خصوصی نمائندے کرنل لوئی جانسن نے، جو مشن کے تفکرات سے رابطہ قائم کئے ہوتے تھے، ۲۲ اپریل کو ایک اخباری انٹرویو میں اور باتوں کے علاوہ یہ کہا:۔

"صرف حملہ آور کو پیچھے دھکیلنے سے ہی ہندوستان دنیا کی بڑی حکومتوں کے درمیان اپنا مقام پیدا کرنے کی توقع رکھ سکتا ہے، ہم ریاست ہائے متحدہ کے لوگ گہری دلچسپی کے ساتھ ہندوستان اور چین کی صورت حال کا مطالعہ کر رہے ہیں، کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایشیا۔ کی تقدیر ہندوستانیوں اور چینیوں کے ہاتھ میں ہے، آزادی کے مقصد کے لئے ایشیا کی ان دو عظیم ہستیوں کے باہمی اتحاد کو بجا طور پر گذشتہ دس صدیوں کا عظیم ترین سیاسی وقوعہ کہا جا سکتا ہے۔"

> **امریکہ، چین اور ہندوستان کو مغرب کے لئے دو مضبوط قلعے بنانا چاہتا تھا**

(کیزنگز کونٹیمپریری آرکائیوز" جلد ۴، ۴۲-۱۹۴۰، ص ۵۲۹۹)

اسی زمانے کے دوران صدر روز ویلٹ نے انڈین نیشنل کانگریس کے رہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، اور مسٹر نہرو کو واشنگٹن کا دورہ کرنے کی دعوت دی، لیکن کانگرسی رہنما کرپس مشن کی طرف سے اپنے پورے مطالبات نہ مانے جانے کی وجہ سے اتنے غصے میں تھے کہ پنڈت نہرو نے واشنگٹن جانے سے انکار کر دیا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی نے ایک بڑی بصیرت کی بات کہی:۔

"اگر برطانویوں نے ہندوستان کو اپنی قسمت پر چھوڑ دیا، جیسا کہ انہیں سنگاپور کو چھوڑنا پڑا، تو غیر متشدد ہندوستان کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ غالباً جاپان ہندوستان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں گے، امریکی فوجوں کو برطانویوں کے ساتھ چلا جانا چاہیئے۔ ہم جانتے ہیں کہ امریکی امداد کا مطلب کیا ہے، آگے جا کر یہ برطانوی کے ساتھ امریکی راج نہیں تو اثر بن جاتے گی۔"

(آر، کوپلینڈ "انڈین پولٹیکس" ۱۹۴۲ء ص ۲۹۰)

۷ مئی کو پھر مسٹر گاندھی نے لکھا کہ "امریکہ جنگ میں پھنسنے سے بچ سکتا ہے اور اب بھی بچ سکتا ہے، اگر وہ اپنے آپ کو اس نشے سے چھڑالے جو اس کی بے پناہ دولت نے اسے چڑھا دیا ہے۔" (ایضاً) ہفتے بھر بعد گاندھی جی نے اعلان کیا کہ "ہندوستان کو خدا کے حوالے کر دو یعنی جدید عام اندازِ گفتگو میں نراج کے سپرد کر دو، اور اس نراج سے کچھ عرصے خانہ جنگی یا بے روک ٹوک ڈکیتیاں واقع ہو سکتی ہیں ان واقعات سے اس غیر حقیقی ہندوستان سے جسے ہم دیکھ رہے ہیں ایک حقیقی ہندوستان ابھرے گا!"

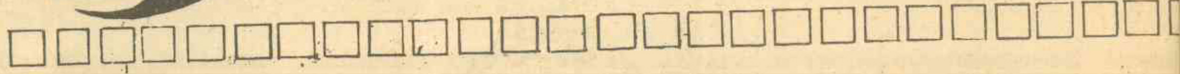
یہاں یہ ذکر بھی کر دیا جاتے کہ بہت سے لوگ اب تک اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب ایک بار تقسیم کا مطالبہ منظور کر لیا گیا تھا تو یہ بہتر ہوتا کہ ملک تقسیم کر دیا جاتا۔ اور ان نگران بیرونی عناصر کو ہٹا دیا جاتا جو ناگزیر طور پر ملکی انتظامیہ، مسلح افواج، پولیس اور عدلیہ کی صفوں میں رہ گئے تھے۔ بیرونی عناصر کو ہٹالئے جانے سے شاید خونریزی زیادہ ہوتی، لیکن اس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان زیادہ واضح اور زیادہ قدرتی خطِ تقسیم کھنچتا، اس سے پاکستان کے لوگوں کو غیر منصفانہ سرحدوں کے فیصلے سے نہ گزرنا پڑتا اور نہ وہ دجل و فریب جھیلنا پڑتا جو ایک ایسے دستاویزِ الحاق کے ذریعے ایک ایسے سربراہ مملکت کی مدد اور اعانت سے جموں اور کشمیر کے باشندوں کے ساتھ کیا گیا تھا جو غیر ملکی تھا اور جس نے تمام مسائل کا جائزہ اپنے ملک کے فائدے کی نگاہ سے لیا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن میں انڈین کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی مجلسوں میں ریاست ہائے متحدہ کے قائم مقام سیکرٹری آف اسٹیٹ ڈین ایچیسن نے لکھا:۔

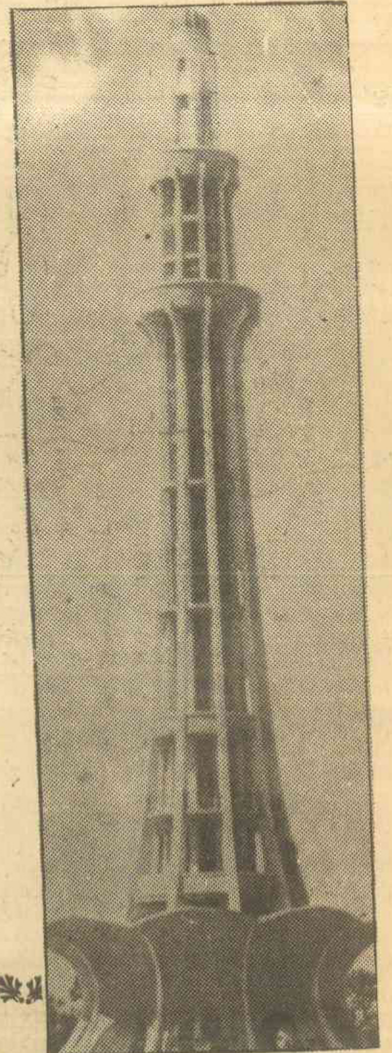
"مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستانی رہنما اس عالی ظرفی کے جذبے کا مظاہرہ کریں جس کی اس وقت ضرورت ہے تو وہ برطانوی کیبنٹ مشن کی طرف سے گزشتہ موسم بہار میں پیش کئے گئے دستوری

باقی صفحہ ۳۴ پر

فارغ بخاری



یوم پاکستان



کیسے ہو نئے سال پہ پیغام کا یارا
دل سوز ہے لب دوز ہے فنکار تمہارا

تاریکیِ ماحول میں دم گھٹنے لگا ہے
دامانِ نظر میں کوئی جگنو ہے نہ تارا

دریوزہ گری راس جو آئی ہے کسی کو
تاچند ہو مانگی ہوئی کرنوں پہ گزارا

مٹتے ہیں کہاں زخم جو مستور ہیں دل میں
بے رحمیِ حالات سے ناسور ہیں دل میں

کچھ تو نظر آتے ہیں چمکتے ہوئے نشتر
اب چارہ گری کا کوئی امکان تو ہوا ہے

بدلے گی فضا، رت آئے گی سہانی
صد شکر کہ کچھ جینے کا ساماں تو ہوا ہے

تو دینے لگے داغ ہی، کچھ کم تو نہیں یہ
دل کے کسی گوشے میں چراغاں تو ہوا ہے

کچھ مہرے تو بدلے ہیں بساطِ دلِ جاں پر
کچھ رنگ نئے دیکھے ہیں رخسارِ جواں پر

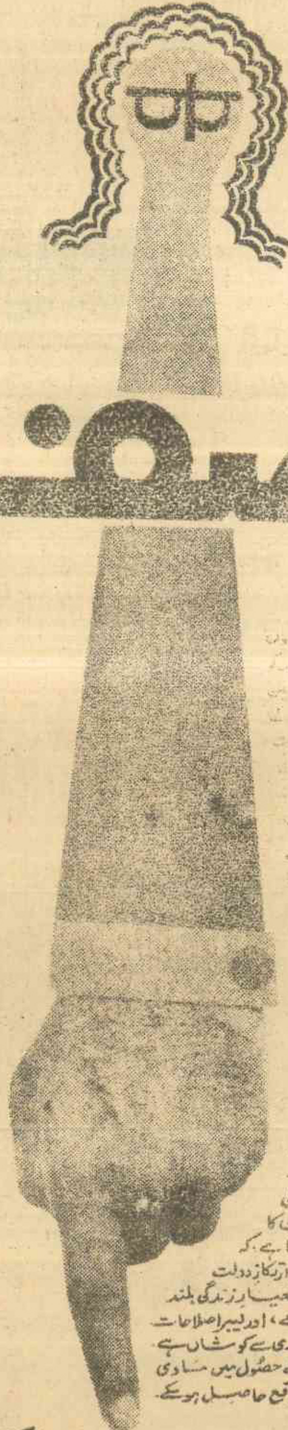
ماحول میں تغیر سا محسوس ہوا ہے
آثار بتاتے ہیں کہ اب رات ڈھلے گی

دم توڑ رہی تھی جو کلی موسمِ گل میں
اٹھتے ہوئے طوفان کے دامن میں پلے گی

مرجھاتے ہوئے پھولوں میں دوڑے گا نیا خوں
اب ایسی ہوا صحنِ گلستان میں چلے گی

یہ آج جو سرمایہ پرستوں میں ٹھنی ہے
شاید کہ غریبوں کی کوئی بات بنی ہے

آپ ہی منصف



جب بورڈ آف انڈسٹریل مینجمنٹ نے ... کو اپنی تحویل میں لیا تھا، تو یہ خیال تھا کہ ان اہم صنعتی ... کو مضبوط انتظامی اور مالی بنیادوں پر کھڑا کیا جا سکے ... بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں۔ ... پیداوار کی سطح بہت کم تھی ... صلاحیت کا فقدان تھا۔ ترقی کی راہ ...

بورڈ آف انڈسٹریل مینجمنٹ کی تحویل میں آنے کے بعد ان ہی کمپنیوں ... نتائج حاصل کئے ... ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء ... ۴۹ فیصد ... کے مقابلے ... ۱۱۹ فیصد اضافہ، ٹیکسوں کی ادائیگی ... کا اضافہ، اجرتوں اور تنخواہوں میں ... کروڑ روپے ... نئے ملازمین کو روزگار۔

فی الحال ٦ پروجیکٹس پر کام جاری ہے اور دوسرے ... پروجیکٹ کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ بڑے مسائل حل ہو چکے ہیں۔ محنت کشوں کو زیادہ سے زیادہ فوائد دئے گئے ہیں۔ پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بی۔ آئی۔ ایم۔ مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

یہ موازنہ خوشحالی کی نشاندہی کرتا ہے ——— آپ کی خوشحالی —— ملک کی خوشحالی —— ہماری خوشحالی پاکستان کا ایک نیا تصور جو اب ابھرا ہے۔ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عوامی حکومت آپ کے روشن مستقبل کی خواہاں اور ارتکازِ دولت کو روکنے، پیداواری صلاحیت بڑھانے، معیارِ زندگی بلند کرنے، محنت کشوں کے حالات بہتر بنانے، اور دیگر اصلاحات کو موثر طور پر نافذ کرنے میں مستعدی سے کوشاں ہے تاکہ ہر ایک کو معاشی فوائد کے حصول میں مساوی موقع حاصل ہو سکے۔

بی آئی ایم ——— بہتر صنعتی کارکردگی کیلئے۔



بورڈ آف انڈسٹریل مینجمنٹ

پاکستان کا مُطالبہ

مَنزل بہ مَنزل



سرسید نے کہا "ہندوستان ایک حور وشمائل دلہن ہے، ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں" اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مغربی مؤرخ لکھتا ہے کہ سرسید ابتدا ہی سے دو قومی نظریہ کے حامی تھے "دو آنکھوں" کا لفظ دو قوموں کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔

• ۱۸۶۷ء میں لسانی تنازعہ زور پکڑ گیا۔ سرسید نے کہا "مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہندو اور مسلمان، دونوں قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، جو زندہ رہے گا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا"

• ۱۶ جنوری ۱۸۸۲ء کو سرسید نے لوکل سیلف گورنمنٹ کے بل پر بحث کرتے ہوئے مخلوط انتخابات کی بجائے ذمی انتخابات پر زور دیا۔

• ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کو عبدالحلیم شرر نے تقسیم ہند کا مطالبہ کرتے ہوئے اپنے رسالے "مہذب" میں لکھا "ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین اور دل شکنی کئے پوری نہیں ہوتیں، اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو اور مسلمان باہم تقسیم کرلیں۔ اور اپنی آبادی علیٰحدہ کرلیں۔"

• ۱۹۱۵ء میں چوہدری رحمت علی نے "بزمِ شبلی" میں خطاب کرتے ہوئے کہا "ہندوستان کا شمالی علاقہ مسلم ہے، اور ہم اسے مسلم علاقے کی حیثیت سے ہی برقرار رکھیں گے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ ہم اس کو ایک مسلم ریاست بنادیں گے۔ اور ہم یہ صرف اسی وقت کرسکتے ہیں جب ہم کو اور ہمارے شمالی علاقے کو "ہندوستانی" کہنا موقوف کردیا جائے۔ اس لئے کہ یہ شرطِ اولین ہے، لہٰذا جتنی جلدی ہم "ہندوستانیت" سے دامن چھڑائیں گے، اتنی ہی ہمارے اور اسلام کے



لئے سود مند بات ثابت ہوگی"۔

• ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد قائدِ اعظم نے کہا "آج سے ہمارے راستے جدا ہیں"۔

• ۱۹۳۰ء میں کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ڈاکٹر اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ خطبۂ صدارت میں انہوں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان کو ملا کر ایک علیٰحدہ ریاست کی صورت دے دی جاتے۔ سلطنتِ برطانیہ کے اندر مسلمان خود اختیار حکومت یا سلطنتِ برطانیہ سے الگ شمال مغرب میں مسلمانوں کی نئی حکومت کی تشکیل



سرسید احمد خان

ہی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حقیقی منزل پوشیدہ ہے۔ نہرو کمیٹی نے اس تجویز کو صرف اس لئے مسترد کردیا کہ اس تجویز کے نفاذ کی صورت میں ایک اتنی بڑی ریاست وجود میں آجاتے

قائد اعظم نے کہا:-

آج سے ہمارے راستے جدا ہیں



گی جسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ ہے اور ہر اعتبار سے باہم یکساں اور کوئی ایسا عنصر ہندوستان میں موجود نہیں، ہندوستان میں صرف مسلمان ہی نہیں جن کو "قوم" کے جدید ترین معانی کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ہندو ہم سے ہر معاملے میں آگے ہے۔ لیکن ہندوؤں کے اندر وہ یکسانیت موجود نہیں جو ایک قوم ایک واحد قوم کا وطن ہے، یہ درحقیقت ایک ایسی ریاست کا لقب ہے جو پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ انگریزوں نے تخلیق کیا ہے... ایسی اقوام میں ہماری بھی قوم شامل ہے، ہندوستان کے پانچ شمالی صوبوں میں چار کروڑ کی آبادی میں تین کروڑ کے لگ بھگ ہماری آبادی ہے، ہمارا مذہب، ہماری ثقافت، ہماری تاریخ، ہماری روایات اور ہمارا معاشی و اقتصادی نظام اور قوانین ان تمام قوموں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں جو باقی ہندوستان میں رہتی ہیں۔ "اب یا کبھی نہیں" یا تو ہم جئیں گے یا پھر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے۔ مستقبل صرف اسی وقت ہمارا ہو سکتا ہے، جب ہم اپنے عقیدہ کے سہارے زندہ رہیں، ان مسلمان بھائیوں کے نام پر جو "پاکستان" میں رہتے ہیں۔ پانچ اکثریتی وحدتوں، پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علیحدہ وفاق کا مطالبہ"۔

• فروری ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ اور کل ہند مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ جس میں "مسلم ریاست" کے سوال پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اور فیصلہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کو مارچ ۱۹۴۰ء میں ہونے والے عام اجلاس میں تجویز کی صورت میں پیش کیا جائے۔

• ۲۲ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں کل مسلم لیگ کے اجلاس عام نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جداگانہ وطن کا مطالبہ کرتے ہوئے "قرارداد لاہور" منظور کی، جس میں کہا گیا "آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی متفقہ رائے ہے کہ کوئی دستوری منصوبہ قابلِ عمل نہ ہوگا، اور نہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔ جب تک کہ وہ ذیل کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں مرتب نہ کیا جائے۔ یعنی یہ کہ جغرافیائی طور پر باہم متصل وحدتوں کی صورت میں حد بندی کا حامل ہو اور بوقتِ ضرورت ردّ و بدل ممکن ہو اور یہ کہ وہ علاقے جہاں مسلمان بلحاظِ تعداد اکثریت میں ہیں، مثلاً شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان، ان کو آزاد ریاستوں کی صورت میں اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ ان میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں"۔

• ۱۰ر اپریل ۱۹۴۶ء کو کل ہند مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی میں ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے حسین شہید سہروردی نے اعلان کیا "اگر ملک پر ایسا آئین مسلط کرنے کی کوشش کی گئی جو متحدہ ہندوستان کے تصور پر مبنی ہوا یا مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کئے بغیر کوئی عبوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لئے ہر ایسی کوشش کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔

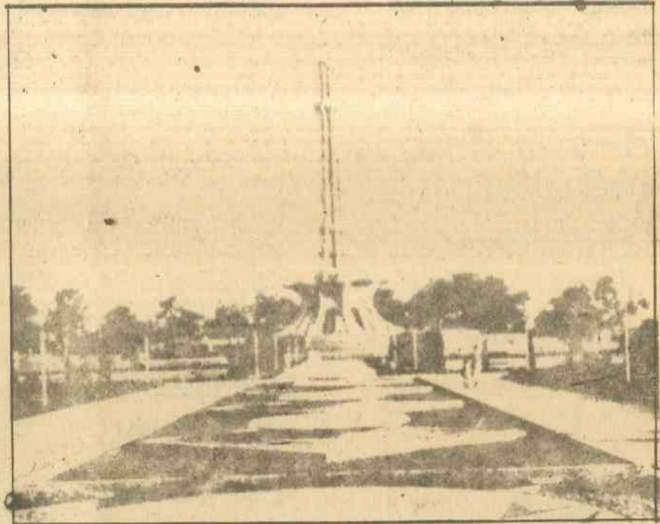
• ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو کل ہند مسلم لیگ کی اپیل پر "یومِ راست اقدام" منایا گیا۔ اس دن صرف کلکتہ میں ۵ ہزار افراد ہلاک اور پندرہ ہزار زخمی ہوئے۔

• ۵ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کر دیا گیا۔

• ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہو گیا۔

• ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی بازو نے علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کر دیا۔

• ۲۲ر فروری ۱۹۷۴ء کو پاکستان نے بنگلہ دیش اور اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔



"ہندوستان نہ تو ایک وحدت ہے اور نہ ہی ایک قوم کا وطن" چوہدری رحمت علی

کا خاصہ ہوتی ہے، جب کہ یہ چیز مسلمان کو اس کے مذہب کی طرف سے تحفہ کے طور پر ملی ہے"۔

• ۲۸ر جنوری ۱۹۳۳ء کو چوہدری رحمت علی نے ایک کتابچہ "اب یا کبھی نہیں" (NOW AND NOT FOR EVER) شائع کیا جس میں مسلم ریاست کو "پاکستان" کا نام دیتے ہوئے کہا گیا "ہندوستان جس طرح موجودہ ساخت میں نظر آ رہا ہے۔ ایک واحد ملک کا نام نہیں ہے اور نہ

• ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کا اجلاس قائدِ اعظم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس نے ایک قرارداد کے ذریعے ہندوستان کو مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا اور کل ہند مسلم لیگ سے کہا گیا کہ وہ ایسی دستوری تجویز مرتب کرے جس کے تحت مسلم اکثریتی صوبے، مسلم دیسی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ایک وفاق کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔





کانگریس نے تقسیم ہند
کیوں قبول کیا؟

لیاقت بجٹ نے کانگریس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا

کانگریس کے بعض ممبر سرمایہ داروں سے ملے ہوئے تھے
ابوالکلام آزاد کا اعتراف

• وہاب صدیقی •

تقسیم ہند کی سخت مخالف تھی کانگریس اور گاندھی جی تو اکثر کہا کرتے تھے کہ "اگر کانگریس تقسیم ہند کو تسلیم کرے گی تو وہ صرف میری لاش کو روند کر کرے گی۔ جب تک میرے جسم میں جان ہے میں تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوں گا، اور اگر میرا بس چلا تو کانگریس کو بھی راضی نہیں ہونے دوں گا۔ میری زندگی میں بھارت ماتا کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔" لیکن کانگریس اور گاندھی جی دونوں نے، قوم پرست مسلمانوں ابوالکلام آزاد اور خان عبدالغفار خاں کی مخالفت کے باوجود تقسیم ہند کا منصوبہ منظور کر لیا۔ آخر اس کے اسباب کیا تھے؟ دراصل لیاقت علی خاں نے عبوری حکومت کے وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے جو بجٹ پیش کیا۔ اُس کے اثرات نے کانگریس اور گاندھی کو تقسیم ہند کے منصوبے کو منظور کرنے پر مجبور کر دیا ۔

کُل ہند مسلم لیگ نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا، عبوری حکومت کیلئے مسلم لیگ کے ممبروں کے نام کا اعلان ۲۵ اکتوبر کو کیا گیا۔ نام یہ تھے، لیاقت علی خان، آئی۔ آئی۔ چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، غضنفر علی خان اور جوگیندر ناتھ منڈل؛ وائسرائے ہند لارڈ ویول کی تجویز تھی کہ عبوری حکومت میں ایک اہم پورٹ فولیو مسلم لیگ کے نمائندے کو دیا جائے۔ اُن کی خواہش تھی کہ امورِ داخلہ کا شعبہ مسلم لیگ کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن سردار پٹیل نے اِس تجویز کی سخت مخالفت کی کیونکہ اُس وقت امورِ داخلہ کا محکمہ اُن کے پاس ہی تھا۔

وہ مسلم کش فسادات کروانے کا منظم منصوبہ بنا چکے تھے۔ اگر امورِ داخلہ کا پورٹ فولیو مسلم لیگ کے نمائندے کو دیدیا جاتا تو اُن کے منصوبہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور کہا کہ اگر اُنہیں امورِ داخلہ کا محکمہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو وہ عبوری حکومت سے مستعفی ہو جائیں گے۔

اِس دھمکی کے پیشِ نظر، کانگریس کی مرکزی کمیٹی نے دوسرے امکانات پر غور کرنا شروع کیا۔ رفیع احمد قدوائی نے مشورہ دیا کہ "محکمہ مالیات مسلم لیگ کو دے دیا جائے۔ مسلم لیگ میں کوئی ماہرِ اقتصادیات نہیں، ویسے بھی معاشیات اور مالیات کے معاملے میں مسلمان کمزور ہو جاتے ہیں اوّل تو مسلم لیگ اِس پیش کش کو منظور نہیں کرے گی اور اگر کر لیا تو اس کا ممبر حماقتیں کرے گا جس سے کانگریس کو فائدہ ہوگا اور وہ یہ ثابت کر سکے گی کہ کاروبارِ مملکت چلانا مسلمانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔" کانگریس کی مرکزی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کر لی اور وائسرائے کو اطلاع دی کہ کانگریس مالیات کا شعبہ مسلم لیگ کو دینے پر تیار ہے۔

قائدِ اعظم نے دوسرے دن ہی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ وہ اسے مسلم لیگ کے لئے بہت بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ اُن کو بالکل امید نہ تھی کہ کانگریس مالیات جیسے اہم شعبے کو چھوڑنے پر تیار ہو جائے گی۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہر ملک اور ہر حکومت میں وزیرِ خزانہ کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے۔ اور حکومت کے ہر شعبہ میں اُن کا عمل دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے لیاقت علی خان کو عبوری حکومت میں وزیرِ خزانہ نامزد کیا اور چوہدری محمد علی سے، جو اُس وقت انڈین اکاؤنٹس سروس میں تھے، کہا گیا کہ وہ لیاقت علی خان کی مدد کریں —!

لیاقت علی خان محکمہ مالیات کے سربراہ بنے تو عملاً حکومت کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں آگئی۔ ہر شعبے اور ہر

بلا تبصرہ — عبوری حکومت میں سردار پٹیل کی اقربا پروری

شملہ کانفرنس کے وقت میں نے اِس بات پر اصرار کیا تھا کہ کابینہ میں پارسیوں کا بھی ایک نمائندہ ہونا چاہیے۔ اب جب کہ کانگریس (انٹرم) حکومت بنا رہی تھی میں نے اِس بات پر پھر زور دیا۔ کچھ بحث و مباحثے کے بعد میرے ساتھیوں نے تجویز مان لی۔ چونکہ پارسی زیادہ تر بمبئی اور آس پاس کے علاقوں میں رہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ پارسی نمائندے کے انتخاب میں سردار پٹیل زیادہ صحیح مشورہ دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے پارسی رکن کا انتخاب پٹیل پر چھوڑ دیا۔ اُنہوں نے مسٹر ایچ۔ سی۔ بھابھا کا نام تجویز کیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ مسٹر بھابھا سردار پٹیل کے لڑکے کے دوست ہیں۔ اور کسی طرح بھی پارسیوں کے لیڈر یا اُن کے نمائندہ تصوّر نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارا انتخاب غلط ثابت ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ کابینہ سے الگ ہو گئے۔

(انڈیا ونس فریڈم۔ از مولانا ابوالکلام آزاد)

لیاقت علی خان نے ٹیکسوں کی چوری بارے میں تحقیقات کروانے کی تجویز پیش کی

محکمے کے منصوبے چھان بین اور منظوری کے لئے اُن کے پاس بھیجے جاتے۔ اُن کی منظوری کے بغیر ایک چپراسی بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ سردار پٹیل اور دیگر کانگریسی وزیر اپنے آقائے ولی نعمت ٹاٹا، برلا اور دیگر سرمایہ داروں کے مفادات کے پیش نظر منصوبے بناتے، لیکن لیاقت علی انہیں مسترد کرتے یا اتنی ردّو بدل کر دیتے کہ کانگریس کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ چنانچہ کانگریسی وزیر عموماً اور سردار پٹیل خصوصاً تقسیم ہند پر رضامند ہو گئے تاکہ لیاقت علی سے چھٹکارہ حاصل ہو سکے۔ اسی اثنا میں لیاقت علی خان نے اگلے سال کا بجٹ پیش کیا۔ یہ بجٹ کانگریس کے اقتصادی منشور کی روشنی میں تیار کیا گیا تھا۔ کانگریس کے انتخابی منشور میں کہا گیا تھا کہ "معاشی اونچ نیچ کو ختم کر کے رفتہ رفتہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے گا۔" اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ "جنگِ عظیم دوم کے دوران سرمایہ داروں نے جو منافع کمایا تھا اُس کا ایک بڑا حصہ چھپا دیا گیا، اور اس پر انکم ٹیکس ادا نہیں کیا گیا ہے، جس کی وجہ حکومت ایک بڑی رقم سے محروم ہو گئی ہے۔ حکومتِ ہند کو ان ٹیکسوں کی وصولی کرنے کے لئے سخت کارروائی کرنی چاہیئے۔"

لیاقت علی خان نے اپنی بجٹ تقریر میں کہا کہ اُنکی تجاویز کانگریس کے ذمہ دار رہنماؤں کے بیانات پر مبنی ہیں۔ انہوں نے دولت مند طبقے، صنعت، اور تجارت پر بھاری ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو غیر ادا شدہ ٹیکسوں کے بارے میں تحقیقات اور اُن کی وصولی کا انتظام کرے۔

ان تجاویز کو دیکھ کر کانگریس اور اس کے حلیف سرمایہ داروں نے شور مچایا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی صنعت کو تباہ اور معاشی نظام کو برباد کرنا چاہتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں اعتراف کیا ہے۔ کہ "ہمارے کچھ ساتھی ایسے تھے جو خفیہ طریقے سے سرمایہ داروں سے ہمدردی رکھتے تھے۔" اس بجٹ کی سب سے زیادہ مخالفت سردار پٹیل اور راجگوپال اچاریہ نے کی۔ سردار پٹیل تو پہلے ہی ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہو چکے تھے انہوں نے اعلانیہ کہنا شروع کر دیا کہ "تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہے۔ چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ لیکن ہندوستان میں دو قومیں ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کو متحد کر کے ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا۔" لیاقت علی کے بجٹ نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ٹاٹا اور برلا نے کانگریس پر دباؤ ڈالا کہ ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہو جائے۔ البتہ گاندھی جی اپنی ضد پر قائم تھے اور تقسیم کی مخالفت کر رہے تھے لیکن ۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو پٹیل نے گاندھی جی سے دو گھنٹے سے زیادہ طویل گفتگو کی۔ اس ملاقات کے بعد گاندھی جی بھی تقسیم ہند کی باتیں کرنے لگے۔ حالانکہ ابوالکلام آزاد اور خان عبدالغفار نے بہت منت سماجت کی لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور پھر کانگریس کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں تقسیم ہند کی سب سے زیادہ مؤثر وکالت گاندھی جی ہی نے کی۔ اور اس طرح اُنہوں نے سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے "بھارت ماتا" کے دو ٹکڑے کرنے پر رضامند ہو گئے۔

تقسیمِ ہند کو قبول کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے رہنما اور ہندوستان کے ماہرین اقتصادیات کا خیال تھا کہ معاشی و مالی اعتبار سے پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے گا اور چند سال کے بعد اسے پھر بھارت کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ اس تجزیہ کے بعد کانگریس نے تقسیم کو مسائل کا عارضی حل سمجھ کر قبول کیا تھا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ پاکستان نے جو اپنا بجٹ بنایا وہ فاضل بجٹ تھا۔ اور پھر کوریا کی جنگ شروع ہونے سے پاکستانی خام مال خصوصاً کپاس اور روئی کے نرخوں میں بہت اضافہ ہو گیا۔ اور کوریا کی جنگ کے دوران توازنِ تجارت پاکستان کے حق میں رہا۔ اس طرح پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔

گذشتہ تین چار برسوں میں محسن بھوپالی کے "منظوم مختصر افسانے" ملک کے دیگر ادبی رسائل کے علاوہ "الفتح" میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے نظم اور افسانے کے امتزاج کی مناسبت سے اس نئی صنف سخن کو "نظمانہ" کا نام دیا ہے۔ امید ہے قارئین پسند فرمائیں گے

• ادارہ •

نظمانے

محسن بھوپالی

دو مُلک ایک کہانی

ابھی ابھی وہ چاٹگام کے نمبر والی کار
یہاں سے گذری ہے
اس کے اندر وہی شگفتہ چہرے تھے
وہی رعونت، رقصاں تھی

وہاں بھی میری قسمت میں تھی
اک فٹ پاتھ
اور یہاں بھی چورنگی پر
محرومی کے سارے سائے ساتھ میں ہیں
امیدوں کے چند غبارے ہاتھ میں ہیں

ارتقائے زوال

برائی سے نفرت ہی کرتا تھا پہلے
کہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہی کچھ سنا تھا
پھر اک وقت آیا —— کہ اوروں کی خاطر
بری چیز کو بھی، بری چیز کہتے ہوئے
میں جھجکنے لگا

—— اب بری چیز کو بھی میں اچھا سمجھنے لگا ہوں!
یہی "ارتقا" کی وہ دلدل ہے جس سے بچانا
کسی اور کے کیا
یہ میرے خدا کے بھی بس میں نہیں ہے
اگر میں نہ چاہوں!

لاھور



نئے وزیرِ اعلیٰ

سب سے پہلے لاقانونیت کے خلاف جہاد کریں

الفتح رپورٹ

پنجاب کے نئے وزیرِ اعلیٰ جناب حنیف رامے نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ "میں نہ اتنی نرمی برتوں گا کہ کمزور کہلاؤں اور نہ اتنی سختی کروں گا کہ ظالم کہلاؤں، میں ظالموں کی گردن پر سوار ہو جاؤں گا اور مظلوموں کی دادرسی کروں گا۔ نظم و نسق کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو درست کروں گا اور عوام کے جان و مال کا تحفظ ہر قیمت پر کیا جائے گا"۔ نئے وزیرِ اعلیٰ کا یہ بیان ہر لحاظ سے عمدہ اور خوش آئند ہے۔ پیپلز پارٹی کا منشور بھی یہی کہتا ہے کہ ملک سے استحصال، ظلم و جبر خواہ کسی شکل میں ہو، ختم کیا جائے گا۔ ماضی میں منشور پر عملدرآمد کے سلسلے میں کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ نظم و نسق اور امن و امان کی بحالی میں کلی طور پر بدعنوان نوکر شاہی پر انحصار کیا گیا جسکی وجہ سے بالخصوص پنجاب میں ایسے واقعات جنم لے رہے تھے۔ جس سے عوام میں یہ تاثر پیدا ہو چلا تھا کہ غنڈوں کے ہاتھوں ان کے جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں ہیں۔ نظم و نسق میں ڈھیل کے سبب سرمایہ دار، ان کے ایجنٹ، پالتو غنڈے اور دوسرے عوام دشمن افراد شیر بن گئے تھے اور جنگل کے قانون پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا غریب اور مظلوم طبقہ خود کو بے یار و مددگار سمجھنے لگا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ لاہور، لائل پور، ملتان اور بعض دوسرے شہروں میں ہزاروں مزدوروں کی چھانٹی معمول بن گئی۔ سرمایہ داروں کے پالتو غنڈے چاقو لہراتے ہوئے یونین کے کارکنوں اور عہدیداروں پر جھپٹتے تھے۔ اخبارات شاہد ہیں کہ کئی ایک جیالے مزدور کارکن ان غنڈوں کی خون آشامی کے بھینٹ چڑھ گئے۔ اور علاقہ کا تھانیدار اپنی مونچھیں اینٹھتا ہوا اللہ ان مزدوروں پر پل پڑتا جو اس کے پاس انصاف طلب کرنے جاتے۔

جناب حنیف رامے نے ابھی ایک ہفتہ پیشتر ہی وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا عہدہ سنبھالا تھا کہ کوٹ لکھپت کے صنعتی علاقہ کی ایک فیکٹری ایئر فوم میں ظلم کا صدیوں پرانا ہتھکنڈہ استعمال کیا گیا۔ فیکٹری کے سیکورٹی افسر نے جو ہر وقت اپنے پاس بھرا ہوا پستول رکھتا تھا، فائرنگ کر کے ایک مزدور نیاز علی کو زخمی کر دیا۔ اس افسوسناک واقعے کے بعد پیکیجز اور دوسری فیکٹریوں کے سینکڑوں مزدوروں نے کام چھوڑ کر پُرزور مظاہرہ کیا۔ بعد ازاں وزیرِ اعلیٰ حنیف رامے بھی وہاں پہنچ گئے۔ سیکورٹی افسر اور فیکٹری کے مینجر کی فوری گرفتاری کا حکم دے دیا، اور ہدایت کی کہ اس واقعہ کی تحقیقات کے دوران فیکٹری کے مالک سے بھی پوچھ گچھ کی جائے۔ اس واقعہ کی تفصیلات کے مطابق فیکٹری کی انتظامیہ اور مزدوروں کی یونین کے درمیان مطالبات کے سلسلہ میں تنازعہ چل رہا تھا، فیکٹری کی انتظامیہ نے مزدوروں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے

> **سیکورٹی افسر کی**
>
> **گولی سے پوری قوم کا**
>
> **بازو زخمی ہو گیا**

لئے ایک شخص امتیاز بٹ کو سیکورٹی افسر تعینات کر دیا۔ جس پر مزدوروں نے احتجاج کیا اور سیکورٹی افسر کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ وہ پُرامن احتجاج کے لئے گیٹ پر جمع ہو گئے اسی دوران سیکورٹی افسر وہاں پہنچ گیا اور اس نے گولی چلا دی جس سے ایک مزدور نیاز علی بازو میں گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد مزدوروں میں اشتعال پھیل گیا۔ مزدوروں کا کہنا ہے کہ فائرنگ، مالکان کے ایما پر کی گئی، اور بپھرے ہوئے مزدوروں کو دیکھ کر اُسے غسل خانہ میں چھپا لیا۔ اس واقعہ کی اطلاع پا کر دوسری فیکٹریوں پیکیجز، پاکستان انجینئرنگ کمپنی وغیرہ کے سینکڑوں مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ وزیرِ اعلیٰ کی فوری مداخلت سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ پولیس نے ایئر فوم کے سیکورٹی افسر امتیاز بٹ کو اقدام قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔

لاہور ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی قابلِ غور ہے۔ نوجوان لڑکوں کے ایک گروہ نے عجائب گھر سے متصل ریستوران "کیمز اسنیک بار" پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ انہوں نے پتھراؤ کر کے ریستوران کو نقصان پہنچایا، اور عملے کو زدوکوب کرنے کے بعد فرار ہو گئے۔ اس سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ لائل پور کے ایک کالج کی طالبات عجائب گھر دیکھنے آئی تھیں۔ اُن میں سے کچھ طالبات ریستوران میں کھانے پینے کے لئے آئیں تو وہاں پر موجود ایک نوجوان نے اُن سے مذاق شروع کر دیا۔ ریستوران کے مینجر کے منع کرنے پر نوجوان ہاتھا پائی پر اُتر آیا۔ اتنے میں نوجوان کے تیس چالیس ساتھی وہاں پہنچ گئے اور اُنہوں نے ریستوران پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ جس سے شیشے اور دوسرے فرنیچر کو سخت نقصان پہنچا۔ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو سیاسی رنگ دینے کی بھی کوشش کی لیکن ریستوران کے مالک نے اس کی سختی سے تردید کرتے ہوئے بتایا کہ وہ نوجوان نشہ میں تھا، اور اول فول بک رہا تھا۔

لاہور میں ظلم و تشدد اور غنڈہ گردی کے واقعات اب معمول بنتے جا رہے ہیں۔ جس سے ہر باشعور شہری کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہ وہی لاہور ہے جس نے چند ہفتے پیشتر بلادِ اسلامیہ کے سربراہوں کو خوش آمدید کہنے کیلئے اپنی آنکھیں بچھا دی تھیں۔ جرائم سے تعلق رکھنے والے افراد نے سماج دشمن سرگرمیوں سے توبہ کر لی تھی۔ عوامی سطح پر مثالی نظم و نسق کا نمونہ پیش کیا گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد غنڈوں اور ملزموں نے دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

نئے وزیرِ اعلیٰ حنیف رامے کو اپنی تقریر کو عملی شکل دینے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا۔ کیونکہ گذشتہ چند سالوں سے "سیاسی غنڈوں" نے متوازی حکومت قائم کر رکھی ہے۔ جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ حکومت کو بدنام کر کے اپنا اُلّو سیدھا کیا جائے۔ وہ غنڈہ گردی اور تشدد بھی پیپلز پارٹی کا نام لے کر کرتے

ہیں۔ حالانکہ پیپلز پارٹی سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں بعض غیر ذمہ دار وزرا کو بھی معاف نہیں کیا جاسکتا جو اپنی سیاسی ساکھ زر خرید غنڈوں کی طاقت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس بدعت کو جاری رکھ کر بلکہ فروغ دے کر پیپلز پارٹی کے حق میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ کہ ان کی پشت پناہی سے انتظامیہ اور پولیس جو پہلے ناپسندیدہ عناصر کا ساتھ چھپ چھپا کر

دیتی تھی، اب کھلے عام ان کی حمایت کرنے لگی جسکے نتیجے میں قتل، اغوا، آبروریزی اور مارپیٹ کے واقعات معمول بن گئے۔ ستم بالاستم ان تمام عوام دشمن سرگرمیوں کو پیپلز پارٹی کے حوالے سے ہوا دے کر حکومت کی بدنامی کے اسباب پیدا کئے جاتے رہے۔ حالانکہ کوئی عقل کا اندھا بھی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ حکومت خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بدنامی کے مواقع فراہم کرے گی۔

نے وزیرِ اعلیٰ کو پنجاب کا تباہ شدہ نظم و نسق در
میں ملا ہے۔ رجعت پسند اپنی شوریدہ سری سے باز نہ آئی
گے۔ غنڈہ گردی کے معمولی واقعات کو بھی پیپلز پارٹی کی
جھولی میں ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ سرمایہ دار اور کارخانہ
الگ سے مزدوروں کو پریشان کر کے صنعتی بدامنی کو جنم دینے
کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی معمولی واقعہ بھی بھُس میں چنگار

باقی صفحہ ۳۴ پر

TRANSPORT SECTION
PCSIR LABORATORIES KARACHI

MINUTES OF THE TRANSPORT COMMITTEE MEETING

Dated:31.12.1973

A meeting of the transport Committee was held on 31.12.1973 at 11.00 A.M. in the Room No.1125.

The following decision were taken:-

1. The Transport subject to availability, will be provided on payment to our employee at his/her marriage on the occassion of Mehdi/Ubtan and Barat.

2. The buses of Ist Trip will run on the IInd Trip timings and those of the IInd Trip will run on the Ist Trip timings with effect from 8.1.1974 for a period of six months. The details will be as under:-

	NAME OF BUS STOP	MORNING	EVENING
IST TRIP	Guru Mandir	7.45 A.M.	4.00 P.M.
	Society	7.45 A.M.	4.00 P.M.
	Liaqatabad.	7.45 A.M.	4.00 P.M.
	Malir	7.30. A.M.	3.45 P.M.
IIND TRIP	Banaras Colony	8.45 A.M.	5.00 P.M.
	Nazimabad	8.45 A.M.	5.00 P.M.
	New Karachi	8.45 A.M.	5.00 P.M.
	Mahmoodabad	8.45 A.M.	5.00 P.M.
	Landhi	9.00 A.M.	5.15 P.M.
	Lyari	as Usual	as Usual
	Colony	as Usual	as Usual

(DR.M.A. WAHID)
Chairman, Transport Committee

C.C. to all Concerned

پردہ چاک

پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹرل ریسرچ

•

لیڈی ڈاکٹر نے

"آیا" کی مرمت

کر ڈالی ——!!

• الفتح رپورٹ •

زخمی الیکٹریشن کو ایک گھنٹے تک طبی امداد مہیا نہیں کی گئی

پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کا قیام ۲۲ سال قبل مرکزی حکومت کے تحت عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد صنعتی میدان میں نت نئی تحقیق کرنا اور ایسی ایجادات کرنا تھا، جس سے ملک کی صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو اور ہماری صنعت جدید تکنیک اور سائنسی اعتبار سے دوسرے ممالک سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ حکومت نے اس ادارے کی تعمیر و ترقی کے لئے بھاری تعداد میں روپیہ صرف کیا۔ جامعہ کراچی کے پاس ایک عالیشان اور جدید طرز کی عمارت تعمیر کی، عملے کے لئے کالونی بنائی اس وقت بھی پی سی ایس آئی آر کو حکومت کی جانب سے اچھی خاصی مالی امداد ملتی ہے۔ اور ادارے کو اپنے [illegible] سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اُس کا اندازہ پانچ لاکھ روپے سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ اتنی زرِ کثیر خرچ کرنے اور ماہرین کی موجودگی کے باوجود اس ادارے کی کارکردگی اچھی نہیں رہی۔ اور کوئی ایسی تحقیق ہوئی اور نہ ایسی چیز ایجاد ہوئی، جس پر یہ ادارہ فخر کر سکے۔ پی سی ایس آئی آر کی موجودہ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ ادارہ ملک اور قوم کے لئے ایک اثاثہ بننے کی بجائے ایک بوجھ بن گیا ہے۔ دراصل یہ سب کچھ نوکر شاہی کا کیا دھرا ہے۔ اُس ہی کے کرشمے نے اس قومی ادارے کو ایک "ذاتی کمپنی" کا روپ دے دیا ہے۔ جہاں ایک فرد اپنی صلاحیت کے سبب نہیں بلکہ خوشامد کے ذریعے ہی ترقی کی منازل طے کر سکتا اور اپنی ملازمت محفوظ رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ افراد جن کے پاس غیر ممالک کی ڈگریاں ہیں۔ یا وہ افراد جن کو پی سی ایس آئی آر تعلیم و تربیت اور تحقیق کے لئے دیارِ غیر بھیجتی ہے۔ کثیر زرِ مبادلہ خرچ کرتی ہے۔ وہ واپس آ کر چند ماہ اس ادارے میں سروس کرتے ہیں۔ پھر داغِ مفارقت دے جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں ڈاکٹر ظہیر، ڈاکٹر ریحان، ڈاکٹر فرنینڈس اور ڈاکٹر بخاری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ افراد اس ادارے سے اس لئے گئے کہ یہاں نوکر شاہی کا راج ہونے کی وجہ سے انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ ان سے اُن کی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں لیا جاتا تھا۔

حکومت نے پی سی ایس آئی آر کی بلڈنگ تو شہر سے بارہ پتھر دُور جامعہ کراچی کے نزدیک بنوائی۔ یہ عمارت اتنی وسیع ہے کہ اس کا صدر دفتر بھی اسی عمارت میں کھولا جا سکتا تھا۔ لیکن صدر دفتر کی نوکر شاہی نے اتنی دور

الفتح

جانے کی زحمت سے بچنے کے لئے اپنا دفتر پاکستان سنٹرل سکریٹریٹ کے بلاک نمبر ۹۵ میں رکھا۔ گذشتہ دِنوں اِس دفتر کو سوسائٹی کے علاقے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ صدر دفتر پی سی ایس آئی آر کی بلڈنگ سے، جہاں بنیادی عملہ کام کرتا ہے، دور ہونے کی وجہ سے کارکردگی افسوسناک حد تک سُست پڑ گئی ہے۔ فائیلوں کی منتقلی میں وقت صرف ہونے کے علاوہ آمدورفت پر کافی اخراجات آتے ہیں۔ پھر دفتری کارروائی میں وقت صرف ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں عملے کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر صدر دفتر پی سی ایس آئی آر کی بلڈنگ میں منتقل کر دیا جائے۔ تو نہ صرف اخراجات میں کمی واقع ہو جائے گی بلکہ کارکردگی میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ عملے کے مسائل بھی کسی حد تک حل ہو جائیں گے۔

میڈیکل سنٹر

پی سی ایس آئی آر کا میڈیکل سنٹر، سنٹرل لیبارٹری اور کالونی سے تقریباً دس میل دور ۳۹ گارڈن روڈ پر واقع ہے۔ آمدورفت میں مریضوں کو جن دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ مریض ہی جانتے ہیں۔ اور اِس پر طرہ یہ کہ میڈیکل سنٹر کا عملہ مریضوں سے توہین آمیز سلوک کرتا ہے۔ گذشتہ دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک مریضہ میڈیکل سنٹر میں آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنی عادت کے مطابق لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ اچھی طرح معائنہ کئے بغیر معمولی دوا دے کر ٹرخا دیا۔ مریضہ بہت بیمار تھی۔ درد اتنا شدید تھا کہ وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی ابتر حالت سے متاثر ہو کر میڈیکل سنٹر کی "آیا" نے درد کی دوائی دے دی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اُسے دوائی دیتے ہوئے دیکھ لیا۔ بس "آیا" کی شامت آگئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے دو، تین ہاتھ مار دیئے۔ مشتاق نامی ایک شخص نے "آیا" کو بچانے کی کوشش کی تو ایک لات اُسے بھی رسید کر دی۔ یہ واقعہ انتظامیہ کے علم میں لایا گیا لیکن لیڈی ڈاکٹر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

میڈیکل سنٹر کے ڈاکٹر نچلے عملے کا علاج ٹھیک سے نہیں کرتے۔ محض گولیوں اور "رنگین پانی" پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ جب کہ افسروں کا علاج نہ صرف توجہ سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی مرضی سے ایسی ایسی دوائیاں لکھوا لیتے ہیں جن کا مرض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر افسروں کے میڈیکل بلوں کی تحقیقات کی جائیں۔ تو اِس سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ پی سی ایس آئی آر افسروں پر کتنا خرچ کرتی ہے اور نچلے عملے پر کتنا خرچ ہوتا ہے۔

یہ ادارہ اپنے نچلے عملے کو طبی سہولتیں مہیا کرنے میں قطعی طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ ۲۵ر فروری ۱۹۷۴ء کو محمد احمد نامی ایک الیکٹریشن پر ایک ائرکنڈیشنڈ پلانٹ گر گیا۔ محمد احمد بیہوش ہو گیا، اور تقریباً ایک گھنٹے تک وہیں پڑا رہا۔ اُسے کوئی طبی امداد مہیا نہیں کی گئی۔ خدا خدا کر کے ایک گھنٹے کے بعد اسٹاف بس (کے اے یو ۹۷۳۲) کا انتظام کیا گیا اور اُسے لیاقت ہسپتال پہنچایا گیا۔ اِسی طرح کے دو واقعات پہلے بھی پیش آچکے ہیں۔ خوشنود الحسن الیکٹریشن سیڑھی سے گر کر بیہوش ہو گیا، اور ایک مرتبہ ایک فوٹو گرافر بھی۔ ان افراد کو بھی ہنگامی طبی امداد مہیا نہیں کی گئی اور وہ کافی دیر تک بے ہوش پڑے رہے۔ حالانکہ ادارے کے پاس اتنی گاڑیاں ہیں کہ حادثہ کی صورت میں زخمیوں کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا جا سکتا ہے۔

ملازمین کی جان و مال کے تحفظ کا فقدان

اپنے ملازمین کی جان و مال کا تحفظ کرنا کسی بھی ادارے کی انتظامیہ کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لیکن پی سی ایس آئی آر کی انتظامیہ اِس سلسلے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اِس بات کا اندازہ اِس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ دِنوں ادارے کے ایک سابق ملازم نے اعجاز احمد نامی لوئر ڈویژن کلرک کو دفتر میں زدوکوب کیا۔ واقعات کے مطابق اعجاز احمد معمول کے مطابق دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ایک سابق ملازم نے اُس پر حملہ کر دیا اور بُری طرح زدوکوب کیا۔ فوری طور پر اِس واقعہ کو انتظامیہ کے علم میں لایا گیا، لیکن حکام بالا نے کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔ حالانکہ اِس سے ادارے کا وقار مجروح ہوا۔ ملازمین میں خوف و ہراس پھیلا۔ اور ادارے کا مفاد اِس میں تھا کہ "ملزم" کے خلاف کارروائی کی جاتی۔

ٹرانسپورٹ

پی سی ایس آئی آر کا اپنا ٹرانسپورٹ کا ایک بیڑہ ہے۔ اس کے انچارج ڈاکٹر عبدالواحد اور سپروائزر حبیب الرحمٰن ہیں۔ لاپرواہی کی وجہ سے بسوں کی حالت خراب ہو گئی ہے یہاں بھی وہی ہوتا ہے جو افسران چاہتے ہیں اور ورکروں کی سہولت، ان کی تکالیف کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ ورکروں کو لینے کے لئے مختلف علاقوں سے بسیں چلائی جاتی ہیں ٹائم ٹیبل کے مطابق نہیں۔ ٹائم ٹیبل میں اندراج کچھ اور ہوتا ہے اور عملاً بسیں کسی اور ٹائم سے چلتی ہیں۔

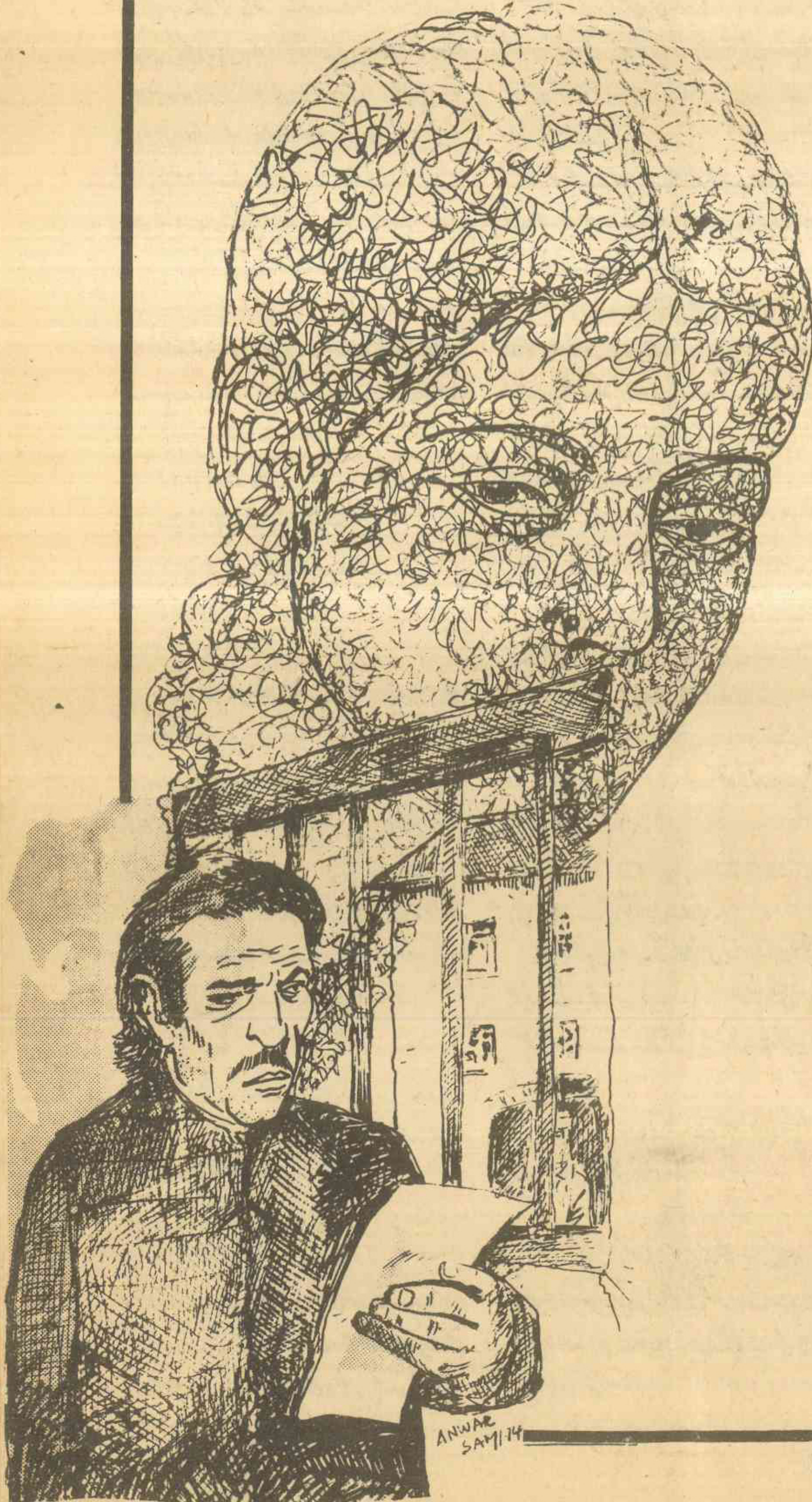
کونسل کے پاس بسیں، ٹرک، رکشہ، موٹر سائیکل، کاریں وغیرہ ہیں مگر ان کا استعمال اِس قدر غلط ہے کہ عملہ اِس سے مکمل استفادہ نہیں کر سکتا۔ بس کے مستری بسوں کی خرابی، پرزوں کی خرابی سے مطلع کرتے ہیں مگر ان کو، اول سامان تو سپلائی نہیں کیا جاتا۔ دوئم، بڑی مشکل سے دیا جاتا ہے نچلے عملے کی رہائش کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے۔ جو رہائشی سہولتیں میسر ہیں ان پر افسران قابض ہیں۔ کار اور گاڑیاں رکھنے والے افسران کالونی کے کوارٹروں، فلیٹ میں رہتے ہیں اور عملے کو نہیں دیئے جاتے۔

ورکروں کے کھانے پینے کے لئے ایک نام نہاد "کینٹین" کا وجود ہے جہاں ایک مرتبہ جانے والا دوبارہ جانے کی زحمت نہیں کر سکتا۔ کینٹین کی حالت بہت ابتر ہے اس کی یہ حالت ایک عرصہ سے چلی آرہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ افسران کو یہاں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کی چائے "اردلی" بناتا ہے اور "لنچ" گھر جا کر بیگم کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کا اس سے کیا تعلق؟۔

ہنستے آنسو

افسانہ

حیات اللہ انصاری



"کیوں جھگڑو! میں اگر تم کو پڑھاؤں تو پڑھو گے۔"

"مجھے پڑھاؤ گے بابو!! مجھے!"

عمر قید کی سزا بھگتنے والے جھگڑو نے چکی روک کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"کیوں اس میں کیا خرابی ہے۔"؟

"مگر یہ بتاؤ کہ پڑھاؤ گے کیا؟"

"تاریخ، جغرافیہ، سیاست۔ اپنے ملک کے بڑے لوگوں کی باتیں۔"

جھگڑو بڑے زور سے ہنسا۔

ہنسی کے مارے اس کا منہ کلھڑ کی طرح دیر تک کھلا رہا۔ اور اس سے کئی اونچی نیچی آوازوں سے بٹی ہوئی ہنسی آتی رہی۔

"کیا کہا۔ تاریچھ، جگرا پھا، اور کا اور کا ای تم ہم کا پڑھئی لو؟"

"واہ بابو، ہم تو دوئی اکشر بھی نا ہیں جانت ہے" مجھے اس کی اس بات پر حیرت ہوئی۔ "مگر تم اپنا جیل کا کارڈ اپنے اور ساتھیوں کے کارڈ سے جب چاہتے ہو الگ کر لیتے ہو۔"

"ان پر تو ہم لوگوں نے خاص خاص نشانیاں لگا رکھی ہیں۔ یہاں پڑھنا کون جانتا ہے؟"

"اچھا کوئی بات نہیں، میں پہلے پڑھنا لکھنا سکھلاؤں گا۔"

"کہا لو گے پڑھنا لکھنا! میری کھوپڑی تو بہت موٹی ہے۔"

"کون کہتا ہے۔ تم تو سب باتوں میں بہت ہوشیار ہو۔"

"مگر بابو جہاں کتاب کا سامنا ہوا میں بدھو بن جاتا ہوں۔"

"تو چلو میں اس طرح پڑھاؤں گا کہ کتاب کا سامنا ہی نہ ہو۔"

جھگڑو کو گھر بہت یاد آتا تھا اور وہ ہر وقت اسی یاد میں گم رہتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ پڑھانے کا طریقہ میں نے یہ نکالا کہ میں پسے ہوئے آٹے پر حروف بنا دیتا۔ پھر اسی پر اس کی مشق کراتا رہتا۔

جھگڑو کو قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ تھا بہت جھگڑالو قیدی اور شاید اسی وجہ سے جیلر نے اسکو میرا ساتھی بنا دیا تھا۔ لیکن مجھ سے اُس نے کوئی جھگڑا نہیں کیا بلکہ چکی پیسنے میں، وہ سدا زور لگاتا تھا، اور کہتا تھا" بابو تم صرف ہاتھ چلاتے رہو۔"

مجھے عدالت نے تو "بی" کلاس دیا تھا، لیکن میرا جیلر

سیاسی قیدیوں کے بارے میں خاص خیالات رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ "اے" کلاس کے ہوں چاہے "بی" کلاس کے، ان سے مشقت لینا ضروری ہے۔ ورنہ پھر یہ بغاوت کی اسکیمیں بنائیں گے۔ اور جیلر کے خلاف سازشیں کر دیں گے۔ میں نے اس سے ذرا بحث کر لی تھی۔ اِس پر وہ کہنے لگا۔

"تمہارا سارا زور نکال دوں گا۔ تم کو ایسے شخص کے ساتھ چکی پسواؤں گا جو مزاج درست کر دے گا۔" شروع شروع میں تو جھگڑو چکی چلانے کا سارا زور میرے اوپر ڈال دیتا تھا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ سیاسی قیدی کون لوگ ہوتے ہیں تو پھر وہ اِک دم سے میرے اوپر مہربان ہو گیا اور چکی کا سارا زور خود لگانے لگا۔

"کیوں بھئی سبق یاد ہو گیا؟"

"کل والا؟ نہیں۔ پرسوں اور ترسوں والا یاد ہے۔"

"خیر کچھ تو یاد ہے۔"

جھگڑو کا اصرار تھا کہ پڑھنا تو ضرور اچھی چیز ہے لیکن لکھنا سیکھ کر کیا کریں گے۔ "کون اب بیٹھا ہے جسے چٹھی لکھیں؟"

"تم تو گھر بہت یاد کرتے ہو۔"

"ہاں بابو بہت۔"

"جسے یاد کرتے ہو، اس کو لکھنا۔"

"نہیں بابو، ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔"

"کیوں؟"

"اب کیا بتلاؤں؟"

آٹے میں حروف بنتے رہے۔ اِس کے بعد پھر اُن سے الفاظ بننے لگے۔ جب جھگڑو الفاظ پڑھنے لگا تو اسکے چہرے پر ایک عجیب تازگی اور امید آگئی اور اس کی دلچسپی بھی بڑھ گئی۔ الفاظ کے بعد آٹے پر عبارتیں لکھی جانی لگیں۔ رفتہ رفتہ جھگڑو ان کو پڑھنے لگا۔

ایک دن میں نے کہا۔ "جھگڑو بھیا، تم کو پڑھنا آگیا، اب تم چٹھی تو پڑھ سکتے ہو۔"

جھگڑو نے ایک دم سے ہاتھ روک دیا۔

"میں چٹھی پڑھ سکتا ہوں!!"

"ہاں!"

اس کی کالی رنگت میں سُرخی دوڑ گئی۔ سانس تیزی سے چلنے لگی اور ہاتھ کانپنے لگے۔

"میں چٹھی پڑھ سکتا ہوں! سچ!"

"ہاں جھگڑو، تم چٹھی پڑھ سکتے ہو۔"

وہ حیرت اور خوشی سے میری صورت تک رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر خوشی کے وہ خطوط ابھر رہے تھے جو یا تو کبھی بنے ہی نہیں تھے یا ابھرنا بھول چلے تھے۔

اِس وجہ سے وہ مسخرا سا لگ رہا تھا۔

"دیکھو بابو، سوچ کر بات کہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں چٹھی پڑھنے بیٹھوں اور نہ پڑھ سکوں۔"

"نہیں جھگڑو اگر چٹھی صاف لکھی ہوئی ہے تو ضرور پڑھ لو گے۔" جھگڑو کی خوشی فکروں اور خیالوں میں ڈوبنے لگی اور ڈوبتے ڈوبتے بالکل غائب ہو گئی۔ چکی گمر گمر چلتی رہی، اور پوری رفتار سے چلتی رہی اور مجھے زور لگانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جھگڑو کی آنکھیں ماضی کے دھندلکوں میں اتنی گہری ڈوب گئیں کہ مجھے اُن کی طرف دیکھنے سے دہشت ہونے لگی۔

دوپہر سے سہ پہر تک جھگڑو کی عجیب حالت رہی۔ پھر اِک دم سے اُس نے کہا۔ "بابو تھوڑی دیر کیلئے آگیا دیدو۔"

"ہاں، ہاں۔"

جھگڑو ایک دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔ میں چکی پیستا رہا۔ اتنے میں جھگڑو کے زور زور سے باتیں کرنے، رونے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں کچھ ایسی عجیب بلکہ وحشت بھری تھیں کہ میں نے جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور چکی چھوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔

جھگڑو ہاتھ میں ایک پرچہ لئے پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی اور آنکھوں میں آنسو، ہاتھ کانپ رہے تھے

"وہ مر گئی تو مر گئی، پر میری رہ کر مری۔ مرتے سمے بھی میری تھی اور اب بھی میری ہی ہے۔ میری ہے۔ ہاں۔"

اب وہ رونے لگا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اِس وقت میرا قریب جانا مناسب نہ ہو گا۔ میں دور کھڑا رہا۔ جب جھگڑو کا رونا ذرا تھما تو میں نے اُسے پکارا۔ "جھگڑو، جھگڑو!"

لیکن جھگڑو بدستور اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ جب میں بار بار پکارے گیا تو اُس نے کہا۔

"بابو، تم چکی چلاتے رہو۔ نہیں تو ہم دونوں کو کوڑے پڑیں گے۔ مجھے آپ سے وہ بات معلوم ہو گئی جس کے معلوم کرنے کے لئے میں پانچ سال سے تڑپ رہا تھا۔ مگر مجھے کون بتاتا۔"

مجھے اس کی ان باتوں سے یہ یقین ہو گیا کہ پاگل نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی آکر چکی پیسنے لگا۔

(۲)

دوسرے دن جھگڑو جب آیا تو اس کے چہرے پر غم بھی تھا، سکون بھی تھا اور ایک مسکراہٹ بھی تھی۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں وہ مردہ پن نہیں تھا جو مجھے اُن میں ہمیشہ نظر آیا کرتا تھا۔

میں نے جھگڑو سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس دن شام کو جب چلنے لگا تو اُس نے بہت ادب اور عقیدت سے میرے پاؤں چھوئے پھر دوسرے دن صبح کو بھی یہی کیا اور شام کو بھی۔ تین چار دن کے بعد جھگڑو مجھے اسی طرح ڈنڈوت کر کے کہنے لگا۔

"بابو تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ میں سات جنموں تک بھی اُسے اتار نہیں سکتا ہوں۔ اگر جیل کے باہر ہوتا تو ایک کام ضرور کرتا۔ وہ یہ ہے کہ تمہارے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیتا۔"

"میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ لیکن تم یہ بتلاؤ کہ تم کو کیا ہوا ہے۔ تم خوش ہو یا غمگین؟"

"میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا ہے تم کو کیسے بتلاؤں۔"

"اچھا یہ بتلاؤ تم اُس وقت جب چکی میرے اوپر چھوڑ کر گئے تھے، کیا پڑھ رہے تھے؟"

"ایک چٹھی۔"

"کس کی چٹھی؟"

"اسی کی، اپنی پتنی کی۔"

"پتنی کی! تم تو کہتے تھے کہ تمہارے کوئی نہیں۔"

"اب وہ کہاں ہے بابو، وہ تو بھگوان کے گھر ہے۔"

"بھگوان کے گھر! پھر اس کی چٹھی تم کو کیسے ملی؟"

"وہ تو پانچ سال ہوئے جب آئی تھی۔ پتنی کو مرے ہوئے بھی دو سال ہو گئے۔"

"چٹھی پانچ سال سے آئی ہوئی تھی۔ پھر تم نے کسی سے پڑھوا کر سن تو لی ہو گی۔"

"یہی تو نہیں کر سکا۔"

"نہیں کر سکے!"

"ہاں، وہ یوں ہی میرے پاس پانچ سال حفاظت سے دھری رہی۔" میرا دل دھڑک کر بولا، پانچ سال! پانچ سال! گذشتہ پانچ سالوں میں کیا کیا ہوا ہو گا۔ مجھے ملازمت ملی۔ شادی ہوئی۔ میرا بڑا لڑکا اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ میں نے ملازمت چھوڑی اور ۴۲ء کی تحریک میں حصہ لے کر جیل میں آگیا۔

ان پانچ سالوں میں ہندوستان میں کیسا انقلاب آگیا۔ ریاستوں میں کانگریسی وزارتیں آگئیں، یعنی وہ لوگ جن کو غنڈہ سمجھا جاتا تھا وہ حکمران بن گئے۔ تعلیم کا نظام بدل گیا، کسانوں کی بے دخلی بند ہوئی۔ اس سے ان کی زندگی کا ڈھانچہ بدل گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا۔ اور پانچ برسوں میں جبکہ یہ چٹھی جھگڑو کے پاس اَن پڑھے پڑی رہی۔

"افوہ!! پانچ سال۔"



جھگڑو کہنے لگا۔

"اگر ایسی ویسی چھٹی ہوتی تو میں پڑھوا لیتا۔ مگر یہ تو اور ہی طرح کی چھٹی تھی۔ مجھے کبھی تو یہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں چھٹی میں ایسی ویسی بات نکلی اور چھٹی پڑھنے والا ہنس دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں اور کبھی یہ کہ اگر چھٹی کی بات اِدھر اُدھر چل نکلی اور یہ قیدی کھلی کرنے لگے تو میں دو ایک کو مار ہی ڈالوں گا۔ بھیا مجھے اپنے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے اسی نے تو مجھے اِس چار دیواری میں، پہنچایا ہے۔"

"میں نے چھٹی پڑھوائی نہیں، پر وہ میرے سینے پر سل کی طرح دھری رہی۔ ہر وقت ہوک اُٹھتی تھی کہ جانے اِس میں کیا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ جس دن جیل سے نکلوں گا اسٹیشن پر پہنچتے ہی کسی بھلے مانس سے کہوں گا کہ بھیا تو اِس چھٹی کو پڑھ دے۔"

"پھر تم نے چھٹی پڑھ لی؟"

"ہاں بابو، پڑھ لی اور پڑھ کر معلوم ہوا کہ میری پتنی میری تھی اور میری ہی رہی۔ مجھے وشواش ہے کہ وہ مرتے سمے بھی میری ہی رہی ہوگی۔"

"تم کو اس پر شک کیوں ہوا؟"

"تم کیا جانو لمبی سزا کیا ہوتی ہے۔ جب عمر بھر کی سزا ہوئی تو میں جوان تھا اور وہ تو بچہ ہی تھی۔ میں نے سزا سنتے ہی پنچوں کو گواہ بنا کر کہدیا کہ میری پتنی جس کے گھر چاہے بیٹھ جائے، میری طرف سے وہ آزاد ہے۔ پھر وہ جب بھی جیل میں ملنے آتی میں اس سے یہی کہتا کہ تو یہ جوانی مرد بنا کیسے بتائے گی، مورکھ؟ جا کسی کی ہو جا۔ مگر بھگوان جانتا ہے کہ اس بات کے کہنے سے میرا کلیجہ پھٹ جاتا تھا۔ پھر میں اپنے جی میں کہتا کہ تیرا کلیجہ پھٹتا ہے تو پھٹ جائے۔ مگر یہ تو سوچ کہ یہ چھوکری عمر قید والے کی پتنی بنکر جیئے گی، تو کیسے جئے گی۔ تم تو نہ جانتے ہوگے کہ جوانی کے شکاری کہاں کہاں ہوتے ہیں۔ اور کیسے کیسے ہوتے ہیں۔ اور جوانی کہاں تک اس کا سامنا کر سکتی ہے۔ پر میں ان باتوں کو جانتا ہوں۔ ایک دن میں دل کڑا کر کے اس پر بہت بگڑا کہ تو میرا ساتھ کہاں تک دے گی۔ اب نہ آیا کر، جا اور کسی کے گھر بیٹھ جا۔ پھر وہ نہیں آئی۔ جب ملاقات کا دن آتا۔ میں بس پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتا۔ پر میں نے کسی سے سندیسہ بھیج کر اُسے بلایا اور وہ نہ آئی۔ میں بہت رو دیا۔ پھر اپنے سے کہا کہ مورکھ تو ہی اسے آنے سے روکتا تھا۔ تو ہی تو اسے آگیا دیتا تھا کہ پرائی بن جا۔ اُس نے اس پر بھی تیرا بہت ساتھ دیا۔ اب اگر وہ ساتھ نہ دے سکی اور جیسا تو کہتا تھا ویسا ہی اُس نے کر لیا تو کیوں روتا ہے؟

"پھر بھی میری آس نہ ٹوٹی۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے۔ کہ کبھی میری یاد آجائے۔ اور وہ اپنے نئے مرد ہی کے ساتھ میرے کنے چلی آئے۔ اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ آخر ایک دن چھٹی آئی۔ میں اسے لے کر منشی کے پاس چلا، کہ پڑھوالوں۔ مگر ذرا دور جا کر خیال آیا کہ اس میں ہوگا کیا۔ یہی نا کہ وہ پرائے گھر بیٹھ گئی۔ یہ پڑھ کر منشی ہنس دیا تو؟ کیا جھگڑو یہ ہنسی برداشت کر سکے گا؟ اِس بات کا خیال آتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ مانو منشی نہ ہنسا، لیکن یہ بات چھپنے سے رہی، ضرور پھوٹ نکلے گی۔ اور پھر قیدی اِدھر اُدھر دیکھ کر ہنسیں گے۔ اُسے میں برداشت کر سکوں گا؟"

"میں نے چھٹی ویسی ہی رکھ لی اور پھر رکھے رہا۔ آخر ایک دن خبر ملی کہ وہ مر گئی۔ یہ سنکر میرے دل کو بہت چوٹ لگی۔ پر میں رو نہ سکا کہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس کی ہو کر مری۔"

"جب تم نے کہا کہ پڑھنا سیکھ لو، اِس وقت یہ بات میرے دھیان میں نہ تھی کہ میں اتنا پڑھ سکوں گا کہ چھٹی پڑھ لوں۔ میرے گاؤں میں ایسے کئی آدمی تھے جو پاٹھ شالہ میں پڑھ چکے تھے۔ پر نہ وہ چھٹی پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ یہ دونوں کام وہ دوسروں سے لیتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو ان کے گھر آئی ہوئی چھٹیاں بھی مہینوں اس انتظار میں پڑی رہتی تھیں کہ کوئی پڑھنے والا آئے تو اس سے پڑھوائی جائیں۔"

"جب تم نے کہا کہ تم چھٹی پڑھ سکو گے....."

"تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر میں نے تم سے الگ جا کر یہ چھٹی نکالی، پڑھی تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ جب چھٹی پڑھی تو اس کی موت پر رو دیا اور اس بات پر خوش ہوا کہ وہ میری رہی۔"

"پھر وہ تم سے ملنے کیوں نہ آئی؟"

"بابو، اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئی تھیں۔ آتی کیسے جانے وہ کس حال میں زندہ رہی، کہیں بھوکوں تو نہیں مر گئی۔"

جھگڑو جیب سے چھٹی نکال کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں درد بھرے آنسو تھے اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ......،

بقیہ
مکتوب پشاور

جھگڑے کے پیچھے کون سی حکومت کارفرما تھی۔ اتفاق سے اُس روز وہ قرارداد مذمت پاس کروانے میں ناکام ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر یونین کے مشورے کے بغیر بلائی گئی ایک خصوصی میٹنگ میں قرارداد پاس کر کے ارمان پورا کر لیا گیا۔ بعد ازاں یونین کے صدر کو بھی بطور احتجاج رخصت کر دیا گیا — اصل ماجرا بہت بعد میں کھلا کہ آئی جی پولیس سے اصلی خطا کیا ہوئی تھی — وہ خطا یہ تھی کہ انہوں نے لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر کی غفلت کے سبب ایک خاتون کی فوتیدگی کے بارے میں محکمہ صحت کے حکام کو شکایت کی تھی — اتفاق سے یہ لیڈی ڈاکٹر خیبر یونین آف جرنلسٹس کی معالجہ تھیں سو پی پی آئی کو، صحافت کا وقار خطرے میں دکھائی دیا اور اُس نے قرارداد مذمت پاس کروالی — یہ قرارداد بھی یونین کی ایگزیکٹو کونسل کی گمشدگی کے عالم میں ایجاد کی گئی تھی — اور یہ اُسی قرارداد کا کرشمہ ہے (غالباً)۔ کہ اِن دنوں پی پی آئی پشاور میں خبر رسانی اور مذمت کی قراردادوں کے علاوہ ائیرپورٹ پر ہیلتھ سرٹیفکیٹ بھی جاری کرتی نظر آتی ہے — کہتے ہیں جماعت اسلامی کے نقشِ قدم پر پی پی آئی نے جو ذیلی اور بغلی ادارے قائم کئے ہیں اُن میں ایک ادارے کے ذمے ہیلتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنا بھی ہے۔ جو پشاور سے کابل جانے والوں کو ٹیکہ لگوائے بغیر بھی مل سکتے ہیں۔

پی پی آئی کو اُن دنوں بھی قراردادِ مذمت کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تھی جب اُس کے نمائندے کی جیب سے پشاور ائیرپورٹ پر پین پستول اور چار امریکی ساخت کے بولٹ پکڑے گئے تھے عین اُس وقت جب وہ اُسوقت کے حزبِ اختلاف کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کے جلسے میں شرکت کے لئے پشاور سے ڈیرہ اسماعیل خان جا رہا تھا — پی پی آئی نے ایک سچی خبر کی مذمت اور درست رپورٹنگ کرنے والے صحافی کے خلاف تو بھرپور احتجاج کیا تھا مگر پولیس کی طرف سے مقدمہ درج کئے جانے اور پستول کی تلاش میں گھر کی تلاشی لئے جانے پر کوئی احتجاج نہ کیا تھا۔ عزت افزائی اور بے عزتی کا مفہوم پی پی آئی کی سمجھ اور اُس کے مفادات سے اُس وقت بھی بالاتر تھا اور آج بھی بالاتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سرحد کی صحافت کا وقار اور اس کی تمام تر حرمت پی پی آئی کے چلے میں جمع ہو گئی ہے۔ جب بھی اس چلے میں کوئی پتھر گرتا ہے، احتجاج کے چھینٹے اُڑتے ہیں۔ پی پی آئی کو اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے ناپاک چھینٹوں سے شرفا کو اس کی جس نجاست سے آلودہ ہونا پڑتا ہے اس کے لئے سب سے پہلے خود وہ مذمت کی مستحق ہے۔

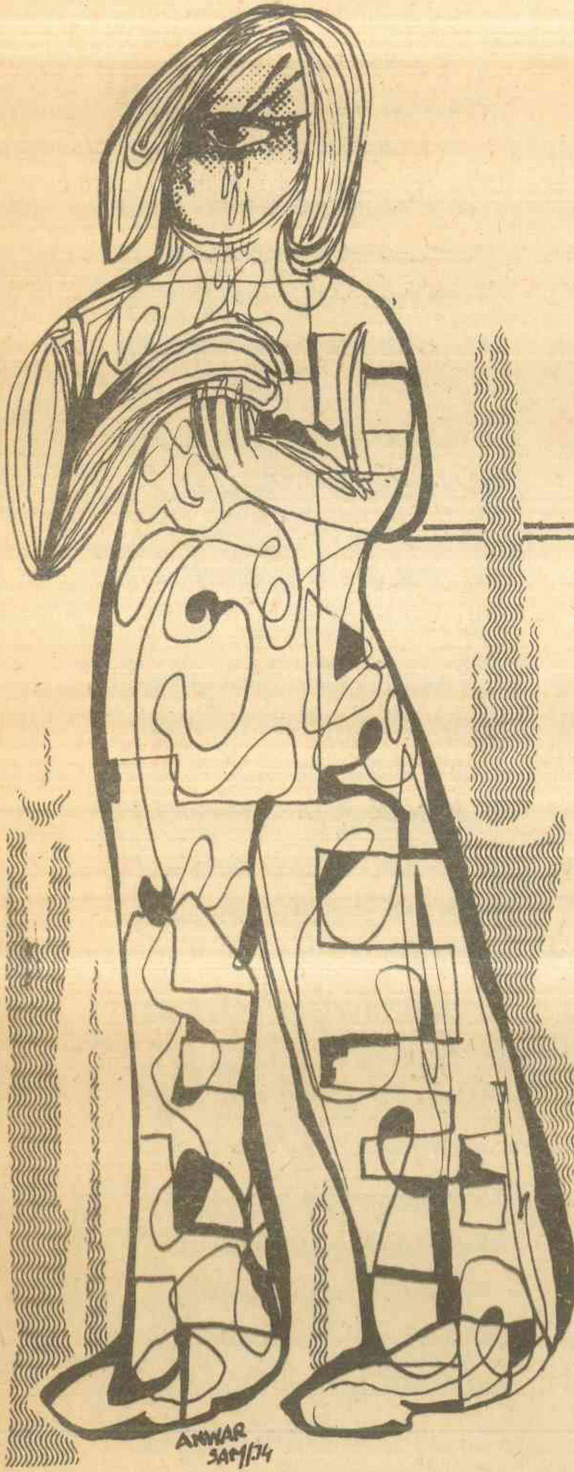
اسمبلی کے پریس روم کے واقعے کے بعد سے اب تک یعنی ۲۱، مارچ کی خبر تک پی پی آئی کی زخم خوردہ اَنا پر جو کچھ گزری ہے ہم اس کی پوری تفصیلات سے آگاہ ہیں — ہم جانتے ہیں کہ ۱۳، مارچ کو ہونے والے واقعے کے بارے میں قراردادِ مذمت ۷، ۸ روز کی تاخیر سے ۲۱ مارچ کو کیوں

شائع ہوئی — یہ تاخیر یقیناً کسی منطقی سوچ بچار کی حامل نہ تھی، معاملہ یہ تھا کہ ان ۷، ۸ دنوں میں پی پی آئی کا نمائندہ گھوڑے دوڑاتا رہا کہ صوبائی وزیر اطلاعات کے ساتھ اس کی صلح ہو جائے — کسی نہ کسی طرح وزیر اطلاعات چار صحافیوں میں اُس کا وقار بحال کرا دیں۔ اُس نے اپنے طور پر نہ صرف پوری کوشش بلکہ مرکزی وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی تک بھی رسائی حاصل کی، مولانا کوثر نیازی گذشتہ اتوار کو نجی دورے پر پشاور آئے ہوئے تھے، جب وہ رات کو بذریعہ ریل واپس جانے لگے تو اُن کی سیلون میں پی پی آئی کے نمائندے کو خاص طور پر اس امید کے ساتھ مولانا نیازی کے نیاز حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ صلح صفائی کرا دیں۔ اور جب مولانا نے بھی صاحبزادے کی حرکتوں پر دُکھ اور حیرت کا اظہار کیا تو قرار داد مذمت اور خیبر یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹو کونسل کی ضرورت محسوس ہوئی — اور ایسی ضرورت جس میں اُس نے ایگزیکٹو کونسل کے الفاظ کو تو استعمال کر لیا مگر افراد سے بات کرنا بھی گوارہ نہ کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یونین صحافیوں کے گھریلو مسائل اور تنازعات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی — پی پی آئی کے نمائندے کے حق میں خیبر یونین آف جرنلسٹس کی گمنام اور یتیم قرارداد کو اگر پی پی آئی کے سقوطِ حمل کی تازہ ترین مثال قرار دیا جائے تو صوبہ سرحد کے اخبار نویس اس پر کوئی تعجب نہ کریں گے۔

---

۲ منٹ خاموشی

سلیم بانڈے



مجھے تمہارا انتظار ہے۔

مَیں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں دو منٹ کے لئے!

ہماری زندگی میں ایک ایسا بھی وقت آجاتا ہے جب آپ لکھنے بیٹھیں، قلم کاغذ پر لگتے ہی، آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور سیاہی کے طور پر، الفاظ ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اِس کے بعد قلم کی سیاہی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اب آپ آہ و فغاں کر سکتے ہیں۔ زندگی کی شاہراہ صاف نظر آتی ہے۔ کوئی رکاوٹ راستہ نہیں روکتی۔ آپ اپنے خیالات، احساسات اور غموں کی گاڑی بڑی آسانی تیزی اور اندھادھند گذار سکتے ہیں۔ کوئی خوف نہیں کسی حادثے کا غم نہیں اور کوئی آپ سے نہیں ٹکرائے گا۔ کیونکہ یہ سب شاہراہیں حادثات اور غموں سے ٹکرانے کے بعد ہی نظر آتی ہیں اور بڑی لمبی ہوتی۔ مگر راہ میں ہر سانس بڑا مشکل اور جان لیوا ہوتا ہے۔

کچھ ایسا ہی وقت آگیا ہے۔ مَیں نے اِس قسم کے وقت سے ملاقات کرنے کی کوئی ذاتی کوشش نہیں کی تھی بلکہ ایسی ملاقات خود بخود ہو جاتی ہے۔ جب آپ ہر طرف سے غموں سے گر جائیں، اور ہمدردی اور سہارا، مداوہ کا کوئی مقام نہ ملتا ہو۔

مَیں سوچتا ہوں کہ مَیں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اور کوئی مجھ سے آکر کہتا یا کہیں پڑھتا تو یقین بھی نہ کرتا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ ایسی جھڑی جو ہر تیز ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے ساون کی جھڑی بن جاتی ہے اور دُکھ یہ ہے کہ خود آپ اپنے آپ سے یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ کیسا غم ہے؟ غم کی شکل کیا ہوتی ہے! یہ کتنا بڑا ہے اور اِس کا ذخیرہ اور وجود ناپنا بے حد مشکل ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بارش ہو رہی ہے۔ بادل ہو کر امنڈتے چلے آرہے ہیں۔ بس کچھ اسی طرح یہ غم کے بادل امنڈے چلے آتے ہیں۔ ان کو غم کے بادل کہنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ یہ کب پانی سے بھاپ بنے اور کب گرم ماحول میں آئے اور کب برسے ——— یہ سب کچھ پلک جھپکنے سے پہلے ہوتا ہے اور جھڑی لگ جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہم لوگ ایسے لوگوں کو، ان کی آنکھوں، ان کے کپکپاتے ہونٹوں اور دِل کے درد سے مخصوص چہرہ دیکھ کر نہیں پہچان سکتے۔

مجھے اِس ماحول میں کون پہچان رہا ہے۔ مَیں غریب بے سہارا، فقیر کی طرح ریلوے گیٹ کے پاس کھڑا کس کے انتظار میں ہوں، تیز ہوا اُڑی جارہی ہے۔ درختوں کے پتّوں کے ہلنے کی آواز آرہی ہے محلے بھر میں لوگ مزے کی نیند سو رہے ہیں۔ دُور افق پر ٹمٹمی روشنیاں بجھتی جلتی ہیں۔ کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں، سڑک ویران ہے۔ کوئی پرندہ املتاس کے درخت میں چھپا دہشت بھری ٹک ٹک کر رہا ہے۔

سچ ہے مَیں اِسے کوک نہیں کہہ سکتا۔ کوک سے اِسکا دور کا واسطہ نہیں۔ یہ ٹک ٹک بدنصیبی کی آواز ہے۔ مگر شائد یہ بھی میرا خیال ہے جو مختلف آوازیں نکال رہا ہے۔ یہ میرے دل کے رونے کی صدا ہے جو اپنے پیارے بچھڑے ہوئے بھائی کو بار بار یاد کر رہی ہے مگر اُسے نہ یاد کرنے کا 'بہروپ' مسکراتے لبوں کے ساتھ' دنیا کے سامنے مجھے پیش کرنا ہے۔

اپنے نوجوان بھائی کے موت کے بعد جب مَیں لوگوں کو پھل اور کھانا کھاتے دیکھتا ہوں تو ٹک ٹک کی آواز میرے سر پر کلہاڑا بن کر گرتی ہے۔

اُف، یہ لوگ۔ کس طرح، کس دِل سے، ایک نوجوان کے زیرِ زمین جانے کے دو دن کے بعد، اطمینان سے بیٹھے کھاپی رہے ہیں۔ حالات پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ کم از کم اس کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کرتے اور چلے جاتے......

دِل کی آواز کو روکتا ہوں مگر نہاں خانہ سے یہ خیال اُبھرتا ہے کہ یہ لوگ، چمکتی گاڑیوں کے چلانے والے۔ داڑھی والے بہروپیوں کو اگر یہ غم ڈس رہے ہوتے تو پھر مَیں دیکھتا کہ یہ کس طرح کیلے کھا کھا کر ڈھیر لگاتے اور مشروبات پیتے ـــ

وہاں، جہاں بے شمار قبریں تھیں، چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ کتبے تھے۔ یہی خوف زدہ دفن کرنے والے، یہ سب کچھ کھا سکتے تھے اور غپ شپ کر سکتے تھے!!

بہت عرصہ ہوا میں نے ایک ادیب کی کہانی پڑھی تھی۔ کہانی کا ہیرو، اپنی ہیروئن سے الوداع ہوتے ہوئے کہتا ہے: "بلاشکا! غم دلوں میں بسا نہیں کرتے۔ چند دنوں کے بعد، کچھ عرصہ کے بعد، میں کہیں دور چلا جاؤں گا اور تم اسی گاؤں میں رہ جاؤ گی۔ یہی جھیل ہوگی، کسی اچھے سے نوجوان کے ساتھ تمہارا بیاہ ہو جائے گا۔ پھر تم مجھے بھول جاؤ گی۔ کیونکہ اے بلاشکا! غم دلوں میں ہمیشہ بسا نہیں کرتے۔"

میں سوچتا ہوں کہ غموں کے بارے میں بہت کچھ وہ بلاشکا کو بتانا بھول گیا۔ اس کا اندازہ آج مجھے ہو رہا ہے۔ رومانی غم تو واقعی ایک بڑے حجم دار سماوار سے نکلتی ہوئی بھاپ کی طرح ہیں جو ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ مگر غم دلوں سے ہرگز نہیں مٹتے۔ غم دھیرے دھیرے دل کے نہاں خانے میں آ چھپتے ہیں اور غم والوں کی آنکھیں بے بس اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ لبوں کی ہچکچاہٹ سند ہو جاتی ہے۔ غربت، بیکاری، دیوانگی کا لبادہ پہن کر وقت کی کچ راہ پر چلتے ہوئے ان کے ہاتھ میں کوئی چھڑی اور سفری تھیلا نہیں ہوتا اور کونے کونے پر خزاں رسیدہ پتوں کے ڈھیر ملتے ہیں، جن کو ہوا اڑا کر چند گز دور بھی نہیں کرتی!

ہاں جب مقدر کی تیز ہوا چلتی ہے اور تنہائی شائیں شائیں کرتی ہے۔ ذہن گفتگو کے دروازے کھول دیتا ہے تو غم ایک پرانے ساتھی کی طرح ہمارے چاروں طرف گھاٹ کے پتھروں کی طرح جم کر حال پوچھتے ہیں۔ عجیب عجیب قسم کی لہریں ٹکراتی ہیں مگر وائے بے بسی! ہل نہیں سکتے۔

لیکن میں ریلوے پھاٹک پر لگی گھنٹی کی آواز سن رہا ہوں۔ گاڑی دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آسمان پر ایک جہاز شور مچاتا ہوا گزر رہا ہے۔ سڑکیں خاموش ہیں۔ ایک سناٹا بھیانک خاموشی کے ساتھ۔

اے بلاشکا! غم دلوں میں چھپ جاتے ہیں۔ آتے جاتے لوگوں کو یہ غمگین بوندا باندی نظر نہیں آتی، کیوں وہ اس میں بھیگ نہیں سکتے۔ وہ مصروف ہیں۔ رواں دواں ہیں۔

میں ریل کی پٹری کے پاس کھڑا ہوں۔

اپنے شہید بھائی کے انتظار میں۔

میں احتراماً خاموش کھڑا ہوں، لیکن میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ میں ایک مجبور، اکیلا، تنہا شخص انتظار کر رہا ہوں۔ اپنے ساتھیوں کا جو آئیں گے، صرف دو منٹ کی خاموشی کے لئے۔

خیبر سے کیماڑی تک

گجرات

مٹی کے تیل کی تقسیم کا ناقص انتظام

نفیس احمد نعمانی

گجرات کے عوام نے عموماً اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے خصوصاً پنجاب کی حالیہ سیاسی تبدیلی کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہ تبدیلی کیوں اور کیسے رونما ہوئی؟ اس بحث میں الجھے بغیر ہم نئے وزیرِ اعلیٰ جناب حنیف رامے سے امید رکھتے ہیں کہ وہ صوبے میں بہتر ماحول اور امنِ عامہ کے قیام کیلئے اپنے تمام وسائل بروئے کار لائیں گے۔ جناب رامے پاکستان پیپلز پارٹی کے بنیادی رکن ہیں، اور ایک انقلابی اور ترقی پسند دانشور اور کارکن کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ لازمی طور پر دکھی انسانوں کے دکھوں اور ارمانوں سے واقف ہوں گے۔ پنجاب کا سب سے سنگین مسئلہ امنِ عامہ کا قیام ہے۔ اس وقت ہر طرف غنڈہ گردی، رشوت، چور بازاری، ڈکیتی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ اس صورتِ حال نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ یہ مسئلہ جناب رامے کی خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔

گجرات، جسے سرسید نے خطۂ یونان کے خطاب سے نوازا تھا۔ آج "مسائلستان" بنا ہوا ہے۔ زیادہ تر مسائل ضلعی انتظامیہ کی نااہلی کے پیدا کردہ ہیں۔ یہاں غنڈہ گردی، رشوت، چور بازاری، اشیاء صرف کی کمیابی عروج پر ہے۔ غنڈوں کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ کچھ عرصہ قبل انہوں نے انتظامیہ کے ایک اہم ستون اور اس کے ڈرائیور کے ساتھ غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن انتظامیہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب نوکر شاہی کا "منشور" حکومت کو بدنام کرنا، اصلاحات کو ناکام بنانا، اور اخبار نویسوں کو دھمکیاں دینا رہ گیا ہے۔ کیونکہ وہ غنڈہ گردی کو ختم کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ صوبے کے نظم ونسق کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ بدعنوان اور نااہل انتظامیہ کو تبدیل کیا جائے اور اس کی جگہ قابل، باصلاحیت اور مخلص افراد کو فائز کیا جائے۔

مٹی کا تیل گجرات کے عوام کے لئے دردِ سر بن گیا ہے۔ مٹی کے تیل کی تقسیم ضلعی انتظامیہ کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ اس نے شہر میں تقریباً ۲۲۸ ڈپو قائم کئے ہیں۔ ڈپوؤں کے پرمٹ کے اجراء میں اقربا نوازی کا مظاہرہ کیا گیا اور ایسے افراد کو ڈپو دیئے گئے جنہوں نے اس سے قبل یہ کاروبار نہیں کیا تھا۔ تقسیم کا انتظام اتنا ناقص ہے کہ محنت کش اور مظلوم عوام کو صبح سویرے اپنے کاروبار پر جانے کی بجائے تیل کے ڈپو کے آگے قطار در قطار کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ البتہ انتظامیہ کے مصاحب اور ان کے اقرباء کے مزے ہیں۔ وہ حکام سے پرمٹ لے کر براہِ راست ایجنسیوں سے پانچ پانچ، چھ چھ ٹین تک حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے قبل گجرات میں پرچون تیل کا کاروبار کریانہ فروشوں کے پاس تھا۔ عوام کو اتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور نہ ہی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ عوام کا مطالبہ ہے کہ پرانا نظام بحال کیا جائے اور تیل کو کھلی مارکیٹ میں فروخت کیا جائے۔

گھی اب کھلی مارکیٹ میں ہے۔ پیشتر ازیں جب ضلعی انتظامیہ کی نگرانی میں تھا تو عام لوگ یہ کہتے پائے جاتے تھے کہ ضلعی انتظامیہ کا ایک رکن گھی کی تقسیم میں ہر جائز و ناجائز کام کرتا اور کرواتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مٹی کا تیل کھلی مارکیٹ میں لایا جائے۔ آخر ضلعی انتظامیہ اسے اپنی نگرانی میں رکھنے کے لئے کیوں بضد ہے۔ آخر کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

پریس قوانین اس لئے نہیں بنے تھے کہ صحافی مشکلات سے دوچار ہوں۔ اخبار کے لئے پریس کی تبدیلی کا قانون اپنی جگہ صاف اور درست ہے۔ لیکن اگر ہمیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پریس تبدیل کرنے کا اختیار نہیں ہے تو پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی سفارش کی نمبرداری بھی ختم ہونی چاہیئے اس لئے کہ ہمارے ہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت دو طرح کی ہے۔ ایک ڈپٹی کمشنر اور دوسرا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسے میں جو صحافی ضلعی انتظامیہ کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کسی وقت بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے اس کے جائز کام میں "پھڈا" ڈال سکتا ہے اور ایسے واقعات کئی جگہ ہوئے بھی ہیں۔ کیا یہ نمبرداری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے لے کر اطلاعات کے افسروں کے سپرد نہیں کی جا سکتی۔ اس دور میں بھی صحافی جب اپنے جائز کام کیلئے ڈپٹی کمشنر کے پاس جاتا ہے تو اسے "انتظار گاہ" ہال میں

پہروں انتظار بھی کرنا پڑتا ہے، اور یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے اِس لئے کہ کالی افسر شاہی کے یہ کل پُرزے یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے خلاف اخبارات میں کسی قسم کی کوئی خبر شائع ہو۔



بہاولپور ... احسان الحق شاکر

رشوت کے بغیر

کوئی کام نہیں ہوتا

گذشتہ سال سیلاب نے پورے پنجاب میں جو تباہی پھیلائی تو ضلع بہاولپور بھی اُس سے متاثر ہوا، اور حکومت نے بہاولپور کو بھی آفت زدہ علاقہ قرار دے دیا۔ قوانین و ضوابط کے مطابق سیلاب زدہ اور آفت زدہ علاقوں کے عوام کی مالی مدد حکومت کرتی ہے اور اُنہیں سہولتیں بھی بہم پہنچاتی ہے۔ جن میں بلاسود قرضے، تقاوی قرضے اور اسکولز، کالجز کے بچوں کی تعلیمی فیسوں کا معاف کرنا بھی شامل ہے۔ مگر بہاولپور میں آفت زدہ اور سیلاب زدہ عوام کے ساتھ جو سلوک نوکر شاہی کے ایجنٹوں نے کیا۔ اُس کو سننے کے بعد انسانیت دم توڑتی معلوم ہوتی ہے "انسانی ہمدردی کا سبق دینے والے مسیحا" لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے اور بہاولپور کے غریب عوام پر قہر بن کر ٹوٹے۔ ان کے جو زخم سیلاب اور بارشوں نے لگائے تھے ان پر پھاہا رکھنے کی بجائے ان زخموں کو اور گہرا کر دیا۔ اور وہ عوام جو پہلے سیلاب اور بارشوں کی وجہ سے اپنے گھر بار سے محروم ہو گئے تھے، ایک دفعہ پھر نوکر شاہی کے ظلم کا شکار ہو گئے۔ اِس سلسلے میں چند ایک واقعات پیشِ خدمت ہیں۔

سیلاب اور بارشوں کی ہولناک تباہیوں کے بعد جناب غلام مصطفےٰ کھر نے اعلان کیا تھا کہ آفت زدہ علاقوں کے طلباء و طالبات سے فیس وصول نہیں کی جائے گی، اور ہوا کیا؟ کہ بہاولپور کے کالجوں اور سکولوں میں اساتذہ اور پرنسپلوں نے زبردستی طلباء و طالبات سے فیس وصول کی۔ اِس طرح جان بوجھ کر آفت زدہ لوگوں کو تنگ کیا گیا۔

حکومت کا یہ اعلان بھی حوصلہ افزا تھا کہ بہاولپور، اور دوسرے شہروں میں بے خانماں برباد افراد اور خاندانوں کو مکان بنانے کے لئے قرضے دیئے جائیں گے۔ اور حکومت ان کی آبادکاری میں بھی مدد کرے گی۔ علاوہ ازیں کسانوں کو ٹیوب ویل لگانے، بیج اور کھاد خریدنے، بیلوں کی جوڑیاں خریدنے اور زرعی آلات خریدنے کے لئے قرضے دیئے جائیں گے۔ اِس سلسلے میں سب سے بڑی شکایت سنی گئی کہ فارم بلیک میں فروخت کئے گئے۔ پھر کاغذات کی تکمیلوں کے دوران کلرکوں کی جیب گرم کرنی پڑی اور جب قرضہ ملنے کی باری آئی تو متعلقہ افسروں نے خود ہزاروں روپے وصول کر لئے۔ حالانکہ قرضوں کی تقسیم کے وقت انتظامیہ کو پیپلز پارٹی ضلع بہاولپور اور دوسری جماعتوں کے عہدیداروں کو اعتماد میں لینا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے بعض بدعنوان عناصر نے بھی اِس موقع پر خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے رشتے داروں کے نام پر قرضے وصول کر لئے۔ اِس سلسلے میں چند ایک عہدیداروں کی آئندہ کسی اشاعت میں نقاب الٹ دی جائے گی۔ کیونکہ اُنہوں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے بغیر کسی وجہ کے قرضوں کی صورت میں وصول کر لئے جس کی وجہ سے ہزاروں مستحق خاندان رہ گئے اور وہ آج بھی غلہ منڈی کی مغربی جانب خیموں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کیا ان کا ضمیر مر گیا ہے؟ کیا انسانی ہمدردی کا سبق دینے والے خود اپنے آپ کو بھول گئے ہیں؟ ایسے لوگوں کے خلاف فوری کارروائی ہونی چاہیئے۔ بہاولپور کے عوام نے وزیرِ اعلیٰ پنجاب کی اِس مہم کا خیر مقدم کیا ہے جو وہ معاشرے کو بددیانت اور راشی افراد سے پاک کرنے کے لئے جاری کی ہے۔ عوام کا وزیرِ اعظم بھٹو اور پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب حنیف رامے سے مطالبہ ہے کہ وہ بہاولپور میں دیئے جانے والے قرضوں کے بارے میں مکمل تحقیقات کرلیں۔

بقیہ • احوال واقعی

اور آزادی کی حمایت کرتے رہیں گے۔"

۱۹ مارچ کو کولمبیا براڈکاسٹنگ کارپوریشن کو انٹرویو دیتے ہوئے سعودی عرب کے وزیرِ تیل شیخ احمد ذکی یمنی نے کہا کہ "عرب ممالک اُس وقت تک امریکہ کو تیل کی سپلائی جاری رکھیں گے جب تک وہ مشرقِ وسطیٰ میں قیامِ امن کے لئے سنجیدگی سے کوششیں کرتا رہے گا۔" ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ بعض عرب ممالک نے اسرائیل کے بارے میں اپنے مؤقف میں لچک پیدا کر دی ہے۔ اُن کی دلچسپی صرف ۱۹۶۷ء کے عرب مقبوضہ علاقوں کی واپسی تک محدود رہ گئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اسرائیل اقوامِ متحدہ کی قرارداد کے مطابق ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ علاقے خالی کر دے تو مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم ہو جائیگا۔ چنانچہ اب وہ اسرائیل کے مکمل خاتمے پر زور نہیں دیتے۔ بلکہ بقول وزیرِ خارجہ سعودی عرب جناب عمر ثقاف "عرب ممالک نے اسرائیل کا وجود برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" جناب عمر ثقاف کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

• طرابلس ۱۶ مارچ (پی پی آئی) سعودی عرب کے وزیرِ خارجہ جناب عمر ثقاف نے کہا ہے کہ عرب ممالک نے مشرقِ وسطیٰ میں قیامِ امن کی خاطر اسرائیل کے وجود کو بھی برداشت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسرائیل کے وجود کو برداشت کرنے کی بنیاد اِس اصول پر ہے کہ اسرائیل ان علاقوں کو خالی کر دے جن پر اُس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا۔

جو عرب ممالک یہ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۶۷ء کے عرب مقبوضہ علاقوں کی بازیابی سے مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم ہو جائے گا' وہ خوش فہمی کا شکار ہیں۔ اور اسرائیل کے توسیع پسندانہ کردار کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اسرائیل نے "جنگِ رمضان" کے مصری مقبوضہ علاقوں کو محض اسلئے خالی کیا کہ عربوں نے متحد ہو کر اُس کے آقائے ولی نعمت ـ امریکی سامراج کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کیا تھا۔ اگر عرب متحد ہو کر یہ اقدام نہیں اٹھاتے تو امریکہ کبھی بھی اسرائیل کو ۱۹۷۳ء کے مصری مقبوضہ علاقوں کی واپسی پر مجبور نہیں کرتا۔ اِس کے علاوہ عرب ممالک کو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اسرائیل مقبوضہ فلسطین پر واقع ہے اور فلسطین کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف فلسطینی عوام اور اُن کی واحد نمائندہ جماعت تنظیمِ آزادیٔ

فلسطین کو حاصل ہے۔ اور تنظیم آزادیٔ فلسطین اسرائیل کے خاتمے اور "آزاد فلسطین" کے قیام کا عہد کئے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ "اسرائیل کے وجود کو برداشت کرنے کا فیصلہ" اسلامی سربراہ کانفرنس منعقدہ لاہور کے فیصلوں کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ اسلامی کانفرنس کے اعلامیہ میں واضح طور پر فلسطینی عوام کے حق خود اختیاری اور اُن کے جائز اور قانونی حقوق دلوانے کا عہد کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ سوچنا کہ صرف ۱۹۶۷ء کے عرب مقبوضہ علاقوں کی واپسی اور "اسرائیل کے وجود کو برداشت کرنے" سے مشرق وسطیٰ میں امن قائم ہو جائے گا، محض خود فریبی ہے۔

بقیہ • مکتوب لاہور

بن سکتا ہے۔ ان حالات میں وزیر اعلیٰ کو اپنی پہلی فرصت میں نظم و نسق اور امن و امان کی صورتحال کی بہتری کی جانب توجہ دینی ہوگی۔ اُنہیں خاص طور پر ایسے عناصر پر کڑی نظر رکھنی ہوگی جو پیپلز پارٹی میں کالی بھیڑ ہیں۔ اور اپنے مفادات کی خاطر گھس آئے ہیں۔ ایسے لوگ سرکاری حلقوں میں بھی موجود ہیں جو بظاہر پیپلز پارٹی اور حکومت کے ہمدرد نظر آتے ہیں۔ لیکن در پردہ سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں سے گٹھ جوڑ کر کے ایسے حالات کو جنم دیتے ہیں جس سے نظم و نسق کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ نہ حکومت کے دوست ہیں اور نہ عوام کے، یہ صرف اپنے مفادات کے غلام ہیں۔ وزیر اعلیٰ کو پارٹی کے منشور کے مطابق ایسے عناصر کی گردنوں پر سوار ہونا پڑے گا۔ اگر ان کے لئے رحم اور مروّت اور جذبۂ خیر سگالی کا مظاہرہ کیا گیا تو یہ لوگ حکومت اور عوام کی گردنوں پر سوار ہو جائیں گے۔

وزیر اعلیٰ نے ایئر فوم فیکٹری کے واقعہ میں ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ اگر اس مثال کو تمام فیکٹریوں میں قائم کیا جائے اور سرمایہ داروں کو خبردار کر دیا جائے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت مزدوروں کے خلاف غنڈہ گردی اور دہشت گردی کا ہتھکنڈہ ہرگز برداشت نہیں کرے گی تو کارخانوں میں مالکان کی جانب سے شروع کی گئی دہشت گردی کا بازار بڑی حد تک ٹھنڈا ہو جائے گا۔ مالکان کے گلے میں قانون کا پھندہ کسا جائے گا تو ان کی ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔ اسی طرح عام شہریوں کے جان و مال کو محفوظ رکھنے اور انہیں پالتو سیاسی اور اخلاقی غنڈوں سے نجات دلانے کیلئے انتظامی مشینری میں انقلابی تبدیلیاں کی جائیں۔ نوکر شاہی پر بھروسہ کرنے کے بجائے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی سیاسی اور اخلاقی تربیت کی جائے اور انہیں نظم و نسق کی بحالی کی عظیم ذمہ داری سونپی جائے۔ تاکہ وہ بتدریج بدعنوان افراد کی جگہ لے کر ایک صاف ستھرے معاشرے کے قیام میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

بقیہ • امریکہ اور متحدہ ہندوستان

مسودے میں دیتے ہوتے ان واضح دفعات کی بنیاد پر ترقی کے میدان میں اکٹھے آگے بڑھ سکتے ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہندوستانی وفاقی یونین قائم کی جائے، جس میں آبادی کے تمام عناصر کے لئے اپنی جائز سیاسی اور اقتصادی امنگوں کے حصول کے لئے کافی گنجائش ہو۔

(دی انڈین اینیوال رجسٹر" ۱۹۴۶ء جلد ۲ ص ۸۸)

ہندوستان اور پاکستان کے ظہور سے چند ماہ پہلے "نظریہ ٹرومین" کا اعلان ہوا، اور اس کے بعد ۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو "مارشل پلان" وجود میں آیا۔ جو مغربی یورپ کی اقوام کو سوویت یونین کے خطرے کے خلاف سہارا دینے کے لئے تھا۔ ریاست ہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی کا بڑا مقصد، کہ کمیونزم کی روک تھام کی جائے، اب ایک واضح شکل اختیار کر گیا تھا۔ ٹرومین کا اصول یونان اور ترکی کو سوویت یونین کی دخل اندازی سے بچانے اور داخلی طور پر کمیونسٹوں کی تخریب کاری کے خلاف مدد دینے کے لئے وضع کیا تھا۔ "مارشل پلان" مغربی یورپ میں کمیونزم کی دخل اندازی کو روکنے کے لئے تخلیق کیا گیا۔ اور ۱۹۴۹ء میں شمالی اوقیانوس کے معاہدے کی تنظیم (نیٹو) سوویت یونین کے فوجی خطرے کے خلاف مغربی یورپ کے دفاع کو مستحکم کرنے کے لئے قائم کی گئی۔ سوویت یونین کے خلاف سخت اور شدید صف آرائی کے اس دور میں مسٹر رچرڈ، پی سٹیفنز نے لکھا کہ وہ باہم مخالف اقوام کے درمیان برصغیر کی تقسیم نے اس کی اقتصادی اور سیاسی فوجی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ اور اس کے مختلف حصوں پر حکومت کے کام کو کہیں زیادہ مشکل بنا دیا تھا۔"

ایک یا دو لکھنے والوں کے خیالات چاہے وہ مصنف کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، کسی حکومت کی پالیسی مرتب نہیں کر سکتے، لیکن جو چیز بلا خوف تردید اخذ کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کے مفادات ایک متحدہ ہندوستان کے طلب گار تھے، تاکہ سوویت یونین کا زیادہ موثر انداز میں مقابلہ کیا جا سکے! اور اقتصادی استحصال کے لئے وسیع تر منڈیاں ہاتھ میں رکھی جا سکیں، تاہم بیرونی کارستانیوں کے باوجود مسلمانوں کا مطالبہ حق خود ارادیت ایسا ناقابل مزاحمت ... تھا کہ نہ برطانیہ اور نہ انڈین نیشنل کانگریس پاکستان کے قیام کو روک سکی۔ وہ پاکستان جو حق خود ارادیت کے اصول کا مجسمہ ہے۔